

سفرنامہ

دنیا کا بذریعہ صحراء تلار مکان شور کرنے کی راستاں

چارس بیلک مہ
تعریف حیدر علی

مشعل

روئے زمین کے بدترین صحراء

تکلامکان

کو عبور کرنے کی داستان

تصنیف: چارلس بلیک مور

مترجم: حمید چہلمی

MashaiBooks.com

انتساب

ٹینا کے نام!

جس کی محبت اور مدد سے یہ معز کہ سر ہو سکا

MashaiBooks.com

ترتیب

صفحہ

7	کلامکان صحراء بور کرنے والی ٹیم کے ارکان	
9	اظہارِ تشرک	
11	حرف آغاز	
14	کلامکان کی کشش	باب 1
25	منصوبہ بندی	باب 2
42	روائی	باب 3
56	صحرائیں آمد	باب 4
71	ضعف، پیاری اور ریت کے پہاڑ	باب 5
81	شہراہ ریشم	باب 6
86	سلسلہ کوہ	باب 7
105	مزارتانغ	باب 8
113	چینی قید خانہ	باب 9
120	سب لوگوں کا خواب	باب 10
129	البیور ساربان	باب 11
139	پانی کا بھر جان	باب 12
147	قدیم آثار کا اکٹھاف	باب 13
153	چینی	باب 14
157	ستارہ شناسی ختم	باب 15

صفحہ

167	سلیمان سے نئنے کا مرحلہ	باب 16
174	ایک فاش غلطی	باب 17
184	موت کا یک پ	باب 18
193	بد شگونی	باب 19
201	صحرا خیز ہو گیا	باب 20
204	حرف آخر	



برطانوی — چینی مشترکہ مہم کے ارکان

ستمبر — نومبر 1993

مہم کے امیر	چارلس بیک مور
مواصلات	ریپورٹ برٹن
ڈاکٹر	کیرولین ایس
مارکیٹ سے مزارتانگ تک چینی ترجمان	رجڈ گراہم
چینی ترجمان اور مواصلات	مارک کیٹو
(مزارتانگ سے لیو پرزا ہو گکے ادا خر تک	کیتھ سٹر
(یو ایس اے) فوٹو گرافر (مارکیٹ سے	
مزارتانگ تک یو اتوں گوز سے تا تر گک تک	
چینی ٹیم لیڈر	گیوجن واٹی
گورنمنٹ سائنس دان	لاڈ زہاؤ
المخیور ترجمان	زہاگ بوجوا
فوٹو گرافر اور مرکزی حکومت کا نمائندہ	چیوالائی
سار بانوں کا سربراہ	عیسیٰ پوتا
(مزارتانگ میں زخمی ہونے کے بعد اس کا انخلہ)	
سار بان	کریم یونس
سار بان	عبدالرشید محمد

ساربان	— روسا خورتا
(عیسیٰ پولتا کے ساتھ مزارتانگ سے انخلاء)	
ساربان	— لوئیلن حسین
ساربان	— امیر اسلام علیل
ساربان (ٹانگو زبستی سے لیونڈ ہوانگ تک)	— عبدالریسے
ساربان (ٹانگو زبستی سے لیونڈ ہوانگ تک)	— سلیمان روسا

امدادی پارٹی

لیڈر اور ہم کا ڈپٹی لیڈر	— بارنی وائٹ سپنر
انتظامیہ اور گاڑی کا ڈرائیور	— لارڈ فرانس سیمور
دوسری گاڑی کا ڈرائیور	— جان تھامس
انتظامیہ	— اینی تھامس
آثار قدیمہ کا محقق	— کرشنا گوہا
ہمہ کا سرکاری آرٹسٹ	— پال ٹرٹر
چینی امدادی ٹیم چار معاونین کے ساتھ تین گاڑیوں میں۔	



اطھارِ تشكُّر

اس مہم کی کامیابی میں باہمی معاونت کی جو روح کا رفرما رہی ہے، اسے میں ہی بخوبی جانتا ہوں۔ برطانوی، چینی اور المغیر پر مشتمل ٹیم کے ارکان اس مہم کی کامیابی کا وسیلہ بنے۔ بارفی وائٹ پسٹر نے نقل و حمل اور لوگوں سے معاملہ فہمی کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا، وہ لائق ستائش ہے۔

ہر ایک کی جرأت اور برداشت کی بہترین تحسین یہ ہے کہ ہم سبھی زندہ سلامت رہے۔ ان اوراق میں سفر کی جو رُوداد ہے وہ ذاتی نوعیت کی ہے۔ یہ ناگزیر تھا کہ میں ہر واقعے کو اس طرح ضبط تحریر میں نہیں لایا جس طرح دوسروں نے اسے پاد رکھا ہو گا، تاہم وہ اس وقت بھی کوتا ہیوں کے مرتب ہوئے تھے اور شاید اب بھی ہوں۔

حکلا مکان صحراء کو عبور کرنے کی مشترکہ برطانوی اور چینی مہم جس پیمانے پر شروع کی گئی اسے ایسی ہی وسیع حمایت درکار تھی، لفظ، مال اسباب اور مشوروں کی صورت میں، کپنیاں، افراد، دوست اور عزیز و اقارب دے سکتے تھے۔ جنہوں نے ہماری مدد کی، میں ان میں سے ہر ایک کا شکر گزار ہوں۔ افسوس ہے کہ صفحات کی تعداد دامانی کے باعث ان میں سے ہر ایک کا نام نہیں لکھا جا سکتا۔

ڈیوک آف ایڈنبرانے ہماری سرپرستی کی، ایڈورڈ ہیٹھ ہماری مہم کے ڈائریکٹر رہے، ان کے سبب سے ہی ہم پر کئی دروازے کھلے، ہماری مہم اپنی نوعیت کی پہلی کلائیکی مہم تھی، اس کا ایک مقصد بچوں کے لیے کینسر فنڈ جمع کرنا تھا۔ ہمیں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی، سائنس تحقیقاتی سوسائٹی، برٹش میوزم، برٹش لابریری، آکسفورڈ

پیونیورسٹی (سکول آف جیوگرافی) کی مدد اور مشورے بھی تھے۔ میں آخر میں اپنی رفیقة حیات ٹینا اور اپنے تین بیٹوں اولیور، جیک اور ٹوبائی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنہوں نے گزشتہ تین سال سے تکلامکان سے میرے جذباتی تعلق کو سمجھا بھی اور پرداشت بھی کیا۔ یہ کتاب مکمل ہونے کے بعد میں اُن کے ساتھ آملا ہوں۔

چارلس بلیک مور

ہپشائز (مئی: 1995ء)

حرف آغاز

جب چارلس بلیک مور نے مجھے بتایا کہ وہ تکلامکان صحراء کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کرنے کا منصوبہ بنارہا ہے تو پہلے میں نے سوچا کہ شاید مجھے سننے میں غلطی ہوئی ہے کیوں کہ تاریخ میں کسی نے بھی اس مشکل ترین صحراء کو سر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، میں نے ہوائی جہاز پر، فضا سے اس صحراء کے ریتلے ٹیلوں اور پہاڑوں کا مشاہدہ کیا تھا اور چند ایسے مہم جو سیاحوں کے ذذکرے پڑھے تھے جنہوں نے اس صحراء کو عبور کرنے کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ مگر بدقتی سے ہار گئے، میرا خیال تھا کہ افق سے افق تک صحراء کو عبور کرنا ممکن نہیں۔

پہلے زمانے میں سرایول شین اور سیبون ہیڈن نے اس بیضوی صحراء کو عمودی طور پر اور وہ بھی چھوٹے اور آسان راستے سے عبور کیا تھا، دونوں نے دریا کو راستہ بنایا تھا، جو صحراء میں سے گزرتا ہوا ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے جو فاصلہ طے کیا وہ چارلس بلیک مور کے مجوزہ راستے کا ایک چوتھائی تھا۔ دوسرے وہ ٹیلوں پر سے نہیں، ان کے درمیان سے گزرا تھا۔

شین اور ہیڈن کی مہمات بلاشبہ نہایت خطرناک تھیں، ان میں اس عظیم صحراء کے کناروں کے اندر اور کناروں کے گرد گزرنا شامل تھا۔ ان کا ایک مقصد آثار قدیمہ اور کئی گم شدہ شہروں کو تلاش کرنا تھا۔ ہیڈن کی پہلی مہم میں دو افراد اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ خود وہ بھوک اور پیاس سے مرتا مرتا بچا تھا۔ شین اور ہیڈن کی مہم کا چارلس کی مہم سے کوئی مقابلہ نہیں تھا، جس نے دو ماہ کی مدت میں 780 میل کا فاصلہ طے کیا۔ چارلس بلیک مور اور ان کی پارٹی نے تکلامکان کو مشرق سے مغرب کی بجائے

مغرب سے مشرق کی جانب عبور کرنے کا انتہائی مشکل فیصلہ کیا۔ مہم کے اختتام پر خود بلیک مور پر عیاں ہوا کہ صحراء کو عبور کرنے کا جو رخ انہوں نے اختیار کیا تھا، اس نے ان کی مہم کو بے حد مشکل بنا دیا۔

مہم کے لیڈر میجر چارلس بلیک مور کو صحراء میں سفر کرنے کا خاصاً تجربہ ہے۔ اس نے لارنس آف عربیا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سفر کیا تھا۔ اس نے مجھے تکلامکان کی مہم میں ساتھ چلنے کی دعوت دی لیکن میں راضی نہیں ہوا۔ مجھے اس کے ساتھ اس صحراء میں جانے کی تحریک نہیں ہوئی، جس کے نام کے معنے ہی یہ ہیں کہ تم اس میں چلے تو جاؤ گے لیکن واپس نہیں آ سکو گے۔ میں نے کنگز افریقین رانفلو میں رہتے ہوئے صومالیہ اور شامی کی نیا میں سفر کیا تھا، لیکن اونٹوں پر، پھر اس کی حیثیت تفریجی سفر کی تھی۔

میں اس کتاب اور اس کے شاندار مصنف کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جو کوئی اس کے نقش قدم پر چلانا چاہتا ہے، وہ ایک بار پھر سوچ لے۔ چارلس بلیک مور اور اس کے ساتھیوں نے جو مصائب جھیلے اور جن خطروں کا سامنا کیا، انہیں جان بوجھ کر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ بلیک مور کا برٹش آرمی سے تعلق ہے۔ اس کے نزدیک اس قسم کے امتحنات اور آزمائشیں معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر کوئی اہم پہلو ہے تو یہ کہ اس نے ایک ایسی پارٹی کی قیادت کی جو بالغیروں اور چینیوں پر مشتمل تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں انہیں کوئی جانی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا۔ اگر کتاب میں کہیں کسی خطرے کا کوئی ذکر آ گیا ہے تو اسے کتاب کے ایڈیٹر کا اثر سمجھنا چاہیے جس نے زور ڈال کر اس قسم کے واقعات زیب داستان کے طور پر شامل کرائے۔

جس کسی نے شین اور ہیڈن کے اس ہوش زبان علاقے کے کناروں کے ساتھ ساتھ جانے اور سیاہ طوفان کا تذکرہ پڑھا ہے، وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تکلامکان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا سفر کتنا زہرہ گداز رہا ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ شین اور ہیڈن کے علی الرغم اس مہم کو ہمنائی اور مواصلات کی جدید سہولت میسر رہی اور جس کے سبب سے وہ اس خوف ناک گزے میں نابود ہونے سے نج گئے،

جہاں صدیوں میں جانے کتنے قافلے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔ لیکن اس سے چارلس بلیک مور اور اس کے ساتھیوں کی غیر معمولی جرأت اور عزم پر حرف نہیں آتا۔ انہوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا اسے یورست کو سر کرنے اور براو قیانوس کو اکیلے عبور کرنے پر حاوی ہونے کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سبجدیدہ سیاحوں اور کارناموں کی انجام وہی میں اولیت حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے اب میدان بہت سکڑ گیا ہے کیوں کہ دنیا کے تمام بڑے صحراء، پہاڑ اور سمندر فتح کیے جا چکے ہیں، لیکن اگر کوئی چیخ رہ گیا ہے تو بلیک مور اس پر پورا اترنے کے لیے منصوبہ بنندی کر رہا ہو گا۔

پیٹر پاکرک

تکلامکان کی کشش

سلیمان نے اونٹ کے پاس گھنٹوں کے مل کھڑے ہو کر اپنی کمر سے خجھر نکالا اور اسے تیز کرنے لگا۔ اس کے چھرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ وہ رات بھرا پہنچی اونٹ کو سہلا تارہا، آنکھ تک نہ جھپک سکا، اونٹ ریت پر، پہلو کے مل پڑا تھا، اس کی آنکھیں کھلی تھیں، جسم میں ہلکی سی لرزش تھی، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ زندہ ہے، وہ ان تیس اونٹوں میں سب سے بڑا تھا جن پر پانی، انداج اور وہ سامان لدا ہوا تھا، جس کی صحراء عبور کرتے وقت، ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ایک رات پہلے اونٹ ایک رینٹلے ٹیلے پر سے گر گیا تھا اس پر لدا ہوا سامان کچاوے سمیت اس طرح گرا کہ اس کی گردان اور اگلی ٹانگیں جذبی گئیں۔ گردان تو شاید ٹوٹ گئی تھی۔ اونٹ کو لکھنی گہری چوٹیں آئی تھیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا تو اس کی گردان دائیں بائیں جھو لئے لگتی۔ وہ زور لگاتا تو جسم لرز جاتا لیکن وہ اٹھنے سکتا۔ ہم نے اسے اٹھانے کا بڑا جتن کیا مگر بے سود۔ اونٹ کو درد اور کرب سے نجات دلانے کی ایک ہی صورت تھی کہ اس کی زندگی ختم کر دی جاتی۔ سبھی سارے بانی سلیمان کے ہم نو اتھے کہ صبح کا انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں، شاید اونٹ کی حالت سنبھل جائے۔ سلیمان کا خیال تھا کہ اونٹ زندہ نہیں پچے گا، اس لیے کہ اس کی ناک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ناک کا ٹھنڈا ہو جانا اونٹوں کی موت کی بڑی نشانی ہے۔ سلیمان شاہراہ ریشم کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کی عمر اونٹوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرتے گزری تھی، اونٹوں کے تعلق میں اسے بڑا تجربہ تھا۔ تمام سارے بانی اس کے تجربے کے معرفت تھے۔ اسی لیے اسے بڑا تسلیم کرتے، اس

کی عزت کرتے اور اس کی بات مانتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اونٹ کی اذیت اس کے مرنے کی صورت ہی میں ختم ہو گی، وہ خاموش تھے۔ وہ سلیمان کے فیصلے کے منتظر تھے۔ اونٹ کو ہلاک کرنے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس لیے بار بار کہتے کہ انشا اللہ اونٹ ٹھیک ہو جائے گا۔

یہ نومبر کا تغیرت مہینہ تھا، درجہ حرارت متفق ۲۰ ڈگری تک گر گیا تھا، ترکستان کی جانب کی برفیلی ہوا چلنے لگی تھی۔ اس سردی میں اونٹ اور زیادہ کمزور اور لاگر ہو گیا۔ صبح ہوئی تو حقیقت تسلیم کرنے کا لمحہ آپنچا۔ ہماری اپنی توانائی کم ہو رہی تھی۔ ساز و سامان پر ریت کی تہہ جنم گئی تھی، نئی افتاد یہ آئی کہ اونٹوں کے لیے پانی ختم ہو گیا اس خیال سے کہ شاید کہیں سے پانی مل جائے، ہم نے مشرق کا رخ کرنے کا سوچا، موسم اور زیادہ خراب ہو گیا۔ زنجی اونٹ کے اٹھنے اور چلنے اور کارروائی میں اپنی جگہ لینے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اونٹ کو وہیں چھوڑتے ہیں، شاید اس کی طاقت لوٹ آئے اور وہ زندہ رہنے کے قابل ہو جائے لیکن یہ احتمالہ خیال تھا، صحرا کی کمزور اور بے یار و مددگار کو کب زندہ رہنے دیتا ہے۔

آخری فیصلہ سلیمان پر چھوڑ دیا گیا۔ بھی سار بان ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ سلیمان کے فیصلے پر عمل ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ سلیمان ہرشے سے لائق کچھ کر گزرنے پر آمادہ تھا۔ اس نے سخت سردی میں اپناروئی دار کوٹ اتارا، آستین چڑھائی اور خیفر نکال کر اونٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے اونٹ کی ناٹکیں رسی سے باندھیں اور پھر خیفر اس کی گردن پر پھیردیا۔ اونٹ کی آنکھوں میں نہ حیرت تھی نہ درد کا اظہار تھا۔ صبح کی مہنٹی اور مدھم روشنی میں وہ ایک لمحے کے لیے چکیں اور بجھ گئیں۔ اس کے لگے پر خیفر چلانے والا کوئی غیر نہیں تھا، اس کا اپنا ہی تھا۔ میں پرے کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ میرا دل بھر آیا، اس میں ایک اونٹ کی جان لینے کے جرم کی چھجن گئی۔ وہ ہمارے لیے پانی اور کھانے کی چیزیں اٹھا کر لایا تھا جن کے بغیر اس لق و دق صحرا میں ہمارا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا صلد ہم نے اسے کیا دیا؟

سلیمان اونٹ پر جھکا۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے کان کو چھواؤ۔ اس کے منہ سے اپنے پچھڑ جانے والے ساتھی کے لیے الوداعی کلمات نکلے اور آنکھوں سے

ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں خجھر پڑا ہوا تھا اور باسیں ہاتھ سے وہ اونٹ کی گردن کو چھپھا رہا تھا، لگتا تھا کہ وہ اللہ سے اپنے لیے معافی اور بریت کی دعا مانگ رہا ہے۔ اس نے اونٹ کی گردن اٹھائی اور اس کا منہ قبلے کی طرف کر دیا۔ سلیمان نے اپنے آنسو پوچھے، کپڑے کی بنی ہوئی میلی چیلی ٹوپی درست کی۔ پھر وہ تیزی سے لپکا، اس نے اونٹ کی شہ رگ کاٹ دی، اونٹ نے اپنی بقا کی آخری خواہش میں جسم کو قدرے اور اٹھایا اور درد سے بلملانے لگا۔ اس کی تانگیں لہرا گئیں۔ سلیمان نے باسیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی ہوئی تھی اور داہنیں ہاتھ سے خجھر کو آری کی طرح چلا رہا تھا۔ اونٹ کی سخت رگیں کامنا آسان نہیں تھیں۔ جب شہ رگ پوری طرح کٹ گئی تو اس سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خون دور دور تک ریت پر پھیل گیا۔ اونٹ کے ہونٹ اور دانت بھینچ گئے تھے۔ اس کے درد کا صرف یہی ایک مظہر تھا۔ اونٹ کا گرم اور سرخ خون آہستہ آہستہ ریت میں جذب ہونے لگا۔

میں نے دل گرفتگی کے ساتھ مشرق کی جانب کے ریتلے ٹیلوں پر نظر کی جنہیں کسی نادیدہ مضبوط ہاتھ نے بے ترتیبی کے ساتھ دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ ان کے درمیان کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے اونٹ کی موت اور صحراء تکلامکان کو عبور کرنے کے ہمارے عزم پر خندہ زن ہوں۔ صحرائے تکلامکان کا شمار دنیا کے سب سے بڑے اور دشوار گزار ریتلے صحراؤں میں ہوتا ہے۔ مقامی زبان میں اس کے نام کا مطلب ہے کہ ”جو کوئی اس میں داخل ہوا، کبھی واپس نہیں آیا۔“ میں اس چینی صحرائے عبور کرنے کا عزم لے کر کیوں تکلامکان اور ہم نے اپنا سب سے بڑا اور قیمتی اونٹ اس کی دلیلیت پر کیوں قربان کیا تھا؟ اس کا جواب پانے کے لیے ہمیں ایک اور منظر پر جانا ہو گا۔ ہم جوئی کا ایک محرك تو میرے اندر کی بے چینی اور جنتوں کا جذبہ تھا دوسرے چند برس پہلے ہم تین ساتھیوں نے جزوی اردن کی وادی روم کے دو قبائلی سارپانوں کے ہمراہ، اردن اور عرب کے صحرائیں سات سو میل کا سفر کر کے ان راستوں کا تعین کیا تھا جن پر لارنس آف عربیا نے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں چل کر عرب قبائلوں کی فوج منظم کی اور کئی مہینیں سر کی تھیں، جو بعد میں گلب پاشا کی فتوحات کے نتیجے میں ماند پڑ گئیں۔ (لیفٹینٹ جنرل سرجان گلب نے 1939 سے

1956 تک عرب ریجن کی کمان کی، ائمہ اور دن کا نجات دہنہ اور اردنی فوج کو منظم کرنے والا تسلیم کیا جاتا تھا) قبائلی ساربانوں نے اس سفر میں جس وفا شعراً اور خدمت گزاری کا مظاہرہ کیا، اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ دو ماہ کی رفاقت کے بعد، جب ہم میں پھر نے کالج آیا تو میں بھوت بھوت کرونے لگا۔ ہم نے صحرائیں پاہم مل کر سفر کی سختیاں برداشت کی تھیں۔ ریتلے طوفانوں اور آگ بساتے ہوئے سورج کی خشم گینی کا مقابلہ کیا تھا۔ ہماری راتیں ریت پر کروٹیں لیتے گز ری تھیں۔ جہاں کہیں پڑاً ہوتا اور آگ کے شعلے بلند ہوتے، عرب بدلوک داستانیں سنانے آ جاتے، یہ داستانیں صدیوں سے ورش درورش چلی آ رہی تھیں۔

مشہور سیاح ولفرد تھیسی گر واحد شخص ہے جس نے اپنے اوپر گزرنے والی واردا توں کا تذکرہ کیا ہے۔ کم و بیش ویسی ہی واردا تیں مجھے بھی پیش آئیں۔ اس نے لکھا ہے کہ ”عرب کے صحراؤں میں وقت گزار کر آنے والا کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کی زندگی اور فکر و خیال میں تبدیلی نہ آئی ہو۔ دھنڈلا سکی، اس پر صحراء پنا اثر چھوڑتا ہے اور وہ اپنی میلان طبع کے مطابق پھر سے صحرائیں جانے کی مدھم یا شدید خواہش ضرور محسوس کرتا رہتا ہے۔ معتدل آب و ہوا، صحراء کی سختیوں کے سامنے بیچ لگتی ہے۔“ یہ ولفرد کی رائے کا اثر تھا کہ پھر سے صحراء کا سفر کرنے کی ٹھان لی۔ گھر پولو مصروفیات بھی میرا دامن نہ پکڑ سکیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری ملاقات ولفرد سے ایک دوست کے ہاں ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کے سفرنامے کا وہ پیرا جس سے صحرائیں مرجانے کی خواہش کا ذکر ہے، بے حد خوب صورت اور دل پذیر ہے۔ اس میں جو شاعرانہ تصور ہے، اس کا جواب نہیں۔ میں نے اسے یاد سے جب یہ پیرا سنایا تو وہ مسکرا دیا۔

میں رائل کالج آف سائنس کا طالب علم تھا۔ ایک سال تک میں نے اساتذہ کے پیچھے سنے۔ لیکن میرے دل میں سائنس کے لیے کوئی رغبت پیدا نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ میں کالج کی لا بصری میں گیا اور ایبلس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ مجھے ایسے خلطے کی تلاش تھی جس میں اپنی تو انائی اور بے چینی کا اظہار اور تکمیل کا سامان کرسکوں۔ میرے نزدیک اس خطے کے چھوٹے یا بڑے ہونے کی نہیں، دشوار گزار ہونے کی اہمیت

تھی۔ دوسرے یہ کہ اس میں کوئی نہ گیا ہوار کسی نے اسے ستر نہ کیا ہو۔ ابتدا میں میری توجہ دنیا کے صحراؤں پر نہیں تھی۔ میری نگاہ پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں پر سے ہوتی ہوئی صحراء پر پڑی۔ مجھے بس کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جس میں اپنی مہم جوئی کی تسلیم کر سکوں اور آج کی دنیا میں جو عملًا سکر کر رہی ہے، کوئی معزکہ سرانجام دے سکوں اور میری دریافت عالمی توجہ کا مرکز بن سکے۔

مجھے چین کے مغرب میں تین شان، پامیر، کیون لیون کے برف پوش پہاڑوں کے درمیان انٹے کی شکل (بیضوی) کی خالی جگہ دکھائی دی۔ اس کی تہائی اور علیحدگی نے میرا دم دل کھینچا۔ ایکلیس میں اس پر تکلامکان صحرائکھا ہوا تھا۔ اس کے مشرق میں صحرائے گوبی تھا۔ دونوں میں مرتفع پہاڑی سلسلے حائل تھے۔ صحرائے گوبی کے بارے میں تو مجھے تھوڑا بہت علم تھا۔ تکلامکان صحراء پہلی بار سامنے آیا تھا۔ اس سے متعلق تفصیل سے جانے کے لیے میں نے ”انسائیکلو پیڈیا“ دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ سطحی ایشیا کا صحراء ہے جو چین کے سکیاگ ک صوبے میں واقع ہے، شرقاً غرباً اس کی لمبائی 700 میل ہے اور زیادہ سے زیادہ چڑھائی 350 میل ہے۔ اس کی اوپرائی 5,000 فٹ ہے، اس پر ریت کی تہہ 1,000 فٹ گھری ہے۔

میں نے یہ تفصیل پڑھی تو میری دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ مزید لکھا تھا کہ یہاں کے درجہ حرارت میں بڑی شدت سے کم بیشی ہوتی رہتی ہے۔ سبزہ ناپید ہے، اور انسانی زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ اس کے علاوہ طول و عرض میں ہزاروں فٹ بلند ریتیلے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس صحراء میں پوشیدہ رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ اس میں چلنے والی تند و تیز ہوا یہیں ریت کو اڑاتی اور اس سے نئے ٹیلے بناتی رہتی ہیں۔ جدید چینی ادیپول نے اسے ”موت کا صحراء“ اور ”دنیا کا سب سے بدترین اور انتہائی خطرناک صحراء“ قرار دیا ہے۔ اس سے کئی داستانیں اور اساطیری کہانیاں والیتے ہیں۔ میں نے تکلامکان صحراء کو مغرب سے مشرق کی طرف عبور کرنے کا تھیہ کر لیا۔ یہ کوئی 800 میل کا سفر ہے۔ مجھے لگا کہ اس سفر سے میری زندگی کا ڈھر آبدل جائے گا۔ میں یہ چیخ قبول کرنے پر قتل گیا۔

دو ہزار برس پہلے قدیم ہان مخطوطوں میں تکلامکان کو ”لیوشا“، لکھا گیا ہے،

جس کا معنی ”ریگِ رواں“ ہے۔ تیز طوفانی ہوا میں، ریت کے ٹیلوں کو حرکت میں رکھتیں، آج یہاں، کل وہاں، ٹیلے بنتے مبتے رہتے۔ پہلے پہل 1895 میں نوجوان سویڈش ہم جوں سیون ہیڈن نے تکلا مکان میں ہم جوئی کا آغاز کیا۔ اس میں اس کی جان جاتے جاتے پہنچی۔ اس کے چار ساتھی المخیور ساربان اور آٹھ میں سے سات اونٹ پیاسے جان ہار گئے۔ سیون ہیڈن کے دردناک تجربے نے تکلا مکان کے خطرناک ہونے کی تصدیق کر دی۔

شاہراہِ ریشم اس صحراء کے کنارے کنارے اور تینين شان اور کیون لیون پہاڑوں کے دامن میں سے گزرتی ہے۔ تجارتی قافلے اور ہم جو سپاہی صدیوں سے اس سے گزرتے آئے تھے۔ جہاں کہیں نخلستان ملتے، وہاں پڑاؤ کرتے اور ستا کر آگے کا سفر اختیار کرتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ قافلے راستہ بھک کر صحراء میں چلے گئے، پھر جہاں سے نکلنے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ بعض اوقات مسافر طوفان میں گھر کر جان گنو بیٹھتے۔ یہ طوفان ”کارابوران“ کہلاتا تھا۔ ایک جرم سیاح البرٹ وان لی کاک نے لکھا ہے کہ گھر سواروں کا ایک پورا قافلہ 1905 میں ایک تجارتی قافلے کے محافظ کے طور پر جاتے ہوئے اس طوفان کے باعث مرمت گیا، بعد میں گھوڑوں اور ان کے سواروں کے ڈھانچے اور پھر دریافت ہوئے۔ وان لی کلاک نے اپنے بعد کے ایک سفر کے دوران میں طوفان کے پیش آنے کا حال لکھا اور بتایا ہے کہ ”آسامان پر بیکا یک اندر ہمرا چھا گیا اور طوفان قافلے پر پھٹ پڑا۔ ریت کنکریوں اور پھروں کا بھکر چلے لگا۔ بگولے اٹھنے لگے جو انسانوں اور جانوروں کو اپنی گرفت میں لے کر بڑی شدت سے پٹختے۔ بڑی بھیاں آوازیں آتیں اور دھماکے ہوتے۔ لگتا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ایسے میں بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ قافلے میں شامل سبھی لوگ اور جانور زمین پر لیٹ جاتے۔ جب طوفان ہم جاتا تو آگے کا سفر اختیار کرتے۔“

اس طرح کے واقعات صحراء کے پیروں کنارے پر واقع مرتفع علاقے میں پیش آتے۔ شاہراہِ ریشم یہاں سے ہی گزرتی اور فالصلوں پر قائم چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے والوں کو آپس میں ملا تی ہے۔ یہ تو صحراء سے باہر کا منظر ہے۔ صحراء کے اندر تو دیرانی ہی دیرانی ہے۔ راہ بھک کر ادھر نکل آنے والے پھر کبھی واپس نہیں گئے۔ مغربی

چین میں اس ویران اور بے آب و گیاہ علاقے نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی۔ میں نے تکلامکان کے بارے میں تمام میرے معلومات اور مواد کا مطالعہ کیا۔ یہ مسافروں، سیاحوں اور نئے علاقوں تک رسائی کے تمنائی لوگوں کے احوال تھے۔ ان میں ذاتی تجربات بھی تھے اور سنی سنائی باقیں بھی تھیں، لیکن حق یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کنارے کے ساتھ ساتھ کے ٹیلوں یا ان سے آگے کے ٹیلوں کی قطار سے ماوراء کیا ہے اور صحرائے تکلامکان میں اتنا اور اس کی وسعتوں تک پہنچنا کتنا پُر خطرہ ہے۔ یہاں پہلے کوئی نہیں گیا تھا کہ اس نے اس کے طبعی حالات کا تذکرہ کیا ہو، کوئی نقشہ بنایا ہو یا رہنمائی کی کوئی صورت پیدا کی ہو۔ یہ ایسا علاقہ تھا جس پر نہ کوئی انسانی قدم پڑا ہو یا جسے کسی انسانی آنکھ نے دیکھا ہو۔ چند سیاحوں کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے صحرائے اس حصے سے گزرنے کا قصد کیا، جس میں ریتلے ٹیلے اور ایک خشک دریا کے آثار تھے۔ دوسرے خصائص نہیں تھے جن کے سبب سے اس خطے میں داخل ہونے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ سیاہ طوفان اور کبھار اٹھنے والے ریتلے جھکڑ کچھ کم نہ تھے کہ چینیوں نے گھڑ لیا تھا کہ اس صحرائے میں دیور ہتھے ہیں جو اس میں داخل ہونے والوں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ مشہور چینی بودھ سیاہ ہوان ساگر ساتویں صدی میں تکلامکان صحرائے جنوبی علاقے کے ساتھ سے گزرا تھا۔ اس نے لکھا کہ ”صحرائے کبھی دردناک چینیں سنائی دینے لگتیں، جو سننے والوں کو حواس باختہ کر دیتیں اور وہ بھول جاتے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ موت ان کا مقدر بن جاتی اور وہ ریت میں دب کر فتا ہو جاتے۔ یہ دیوؤں اور بدر و حوں کا کیا دھرا ہوتا“، ہوان ساگر نے صحرائے تکلامکان کے ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کنارے پر رہنے والے خانہ بدوشوں کی ان قدیم بستیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں ریت نے اپنے دامن میں ہمیشہ کے لیے ڈھانپ لیا ہے۔ کئی لوگ ان بستیوں میں مدفنوں سونے چاندنی کے خزانوں کی تلاش میں نکلتے اور صحرائی کی پہاڑیوں میں کھو جاتے۔ شاید ہی کوئی اس مہم سے زندہ سلامت واپس لوٹا ہو۔

ان قصوروں سے میں بھی متاثر ہوا اور صحرائے میں اترنے کے میرے عزم اور شوق کو مہیز ملی۔ میں نے بھی اس راز کو اس خوف سے دل میں چھپائے رکھا کہ کہیں کوئی

اسے چرانہ لے۔ بہر حال تکلا مکان کئی پہلوؤں سے ایک ممتاز تھا جسے سمجھنا اور سمجھنا شاید کبھی ممکن نہ ہو۔ مجھے اپنی تحقیق کے دوران میں پیغمبر ہاپکر کی کتاب ملی، جو کئی لحاظ سے بے مثل ہے۔ یہ اس علاقے کے تفصیلی مطالعے پر محیط ہے۔ اس میں ان سیاحوں اور ہم جوڑوں کا بھی ذکر ہے جو وقتاً فوقتاً اس صحرائیں اترتے رہے۔ میں اس مصنف کی تلاش میں اس کے گھر لندن میں جا پہنچا۔ اس نے مجھے کہا کہ یہ خیال رکھیے کہ تکلا مکان صحرائیں پہلے پہلے جانے والوں کا مقصد قدیم بستیوں کی تلاش کرنا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی ہم کے ضمن میں ایسی منصوبہ بندی نہیں کی تھی جس طرح آپ نے کی ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تکلا مکان کو ایک سرے سے دوسرے تک عبور کرنے کی کوشش کرنا تو درکار، اس کا کسی نے سنجیدگی سے سوچا بھی نہیں تھا۔ تم صحرائے عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس مہم میں تم پہلے شمار ہو گے۔

پیغمبر سے ملاقات نے مجھے حوصلہ دیا اور میری ہمت بندھائی اور میں اس خطے کو جسے انسانی قدموں نے پہلے کبھی چھوٹنہیں تھا سر کرنے کل کھڑا ہوا۔ صحرائیں تیل کے ذخائر کے اکشاف نے رازوں کی اس سرزی میں کو اپنا سب کچھ ہر ایک کے لیے اگل دینے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اب دوسروں پر سبقت لے جانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں ان سب سے پہلے اس صحرائے عبور کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دنیا کی بڑی تیل کمپنیوں نے تارم کے طاس کے علاقے میں تیل کے ذخائر کو بروئے کار لانے کا منصوبہ بنارکھا تھا۔ تکلا مکان اسی طاس کا حصہ ہے، ظاہراً تیل کمپنیوں کی رسائی کے بعد اس صحرائے عبور پر کھل جانا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہر کوئی یہاں زتاٹے بھرنے لگے مجھے اپنا لقدم منوانے کا اہتمام کر لینا چاہیے۔ مجھے صحرائیں سے گزرتے ہوئے اور دوسرے سرے تک پہنچنے میں پانچ سال لگ سکتے ہیں۔ اس عرصے کے آخری دو برسوں کے ضمن میں تفصیل سے منصوبہ بندی کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس سلسلے میں آغاز تو کر دیا لیکن پیکنگ کے تن من سکواڑ کے تجربات اور واقعات میری حوصلہ ٹکنی کا موجب تھے۔ اس لیے میں نے اپنی مہم کو مونخر کر دیا۔ البتہ اپنے مقصد کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میں اس دوران میں اپنی رجحت کے ساتھ چہاں کچھ عرصہ بیرون ملک مقیم رہا وہاں اپنے افراد خانہ کی تعداد بڑھانی۔

تکلامکان کے گم شدہ شہروں کے بارے میں سیون ہیدن اور سرایورل شین کی بتائی ہوئی تفصیلات اور حکایات، میری دلچسپی کا موجب رہیں۔ ان دونوں اصحاب کے نام و سطی ایشیا کے تذکروں کا بڑا اہم حصہ ہیں۔ ۱۹ ویں صدی کے اوآخر میں تو ان کا ذکر کرنا فیشن بن گیا تھا۔ سیون ہیدن نے جس وقت نظر سے علاقے کے نقشے بنائے یہاں کے جغرافیائی حالات قلم بند کیے اور طبعی آثار کا جائزہ پیش کیا، اس کی بنا پر سیاحت اور ہم جوئی کے باب میں اس کا نام ادب و احترام سے لیا جانے لگا۔ اس نے دنیا کے اس پراسار خلیٰ پر سے اخفا کے پردے سر کا کر پوری دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ اس زمانے میں صحراۓ تکلامکان کے آخری کناروں تک پہنچنا بھی بڑا جان چوکھوں کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ہیدن نے ۱۸۹۰ اور ۱۸۹۹ میں چار سفر کیے جن سے یہاں کے جغرافیائی احوال کے بارے میں نئے اکتشافات ہوئے۔ ہنگری کے اوریل شین نے، جس نے بعد میں برطانوی شہرت اختیار کر لی مئی ۱۹۰۰ تک، جب اس کی عمر ۳۷ برس تھی قراقروم کے سلسلہ کوہ اور تکلامکان کے ٹمن میں کسی ہم کا آغاز نہیں کیا تھا۔ بعد میں اس نے سروے آف انڈیا کے رام سنگھ کے ساتھ مل کر اس خطے کے نقشے بنائے۔ اسی دوران میں ہیدن اور شین اور کئی دوسرے ہم جو سیاحوں کے درمیان صحرا کے خفیہ خزانہ تک رسائی کے لیے دوڑسی شروع ہو گئی۔ وان لی کارک بھی اس دوڑ میں شامل تھا۔ ۱۹۱۴ اور ۱۹۰۲ کے درمیانی عرصہ میں جن مہینوں کا آغاز ہوا، ۱۹۳۰ میں چینی حکام نے انہیں نامراد اور لا حاصل گردان کر بند کر دیا۔ ان کے سبب سیاحوں کے لیے یہ علاقے منوع قرار دے دیے گئے۔

ہیدن اور شین نے اس دشوار گزار علاقے میں قدیم بودھ بستیوں کے آثار دریافت کیے جن سے پتہ چلتا تھا کہ ابتدائی عیسوی صدیوں میں شاہراہ ریشم پر تجارتی قافلوں کا گزر ہوتا رہا۔ شاہراہ ریشم کے ذریعے جو تجارتی روابط قائم ہوئے، وہی انڈیا سے چین میں بده مت کی ترویج کا وسیلہ بنے۔ اسی حوالے سے سرہنڈین آرٹ کو فروغ ملا، یہ اصطلاح ہیدن کی اختراع تھی۔ اس انڈین آرٹ نے پہلی مرتبہ مہاتما بده کو انسانی شکل دی۔ اس راستے چینی و سطی ایشیا بده مت سے آشنا ہوا اور بودھوں

نے جو بستیاں بسائیں ان میں سٹوپے، راہب خانے اور دوسرے آثار بننے لگے۔ یہ صحراء کے کنارے تک ہی موجود نہیں تھے، صحراء کے اندر تک میں بننے اور فروغ پذیر رہے۔ کیون لیون سلسلہ کوہ پر جنے والی رفر پہلوتی تو اس کا پانی ہوتا، کریا اور اندرے دریاؤں کی صورت میں بودھ بستیوں تک پہنچتا۔ یہ دریا صحراء کے کنارے پر تو بڑے تیز رفتار بھی رہے اور خاصے و سچ بھی، لیکن ان کا پانی چھوٹے چھوٹے نالوں کی شکل میں صحراء کے اندر تک جاتا۔ یہ پانی زراعت کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور دیہی معاشرے کی تشكیل کا وسیلہ بنا۔

تائگ خاندان (618-907ء) کے دور اقتدار کے دوران میں شاہراہ ریشم کے آرٹ اور تہذیب و تمدن نے بڑا عروج پایا۔ لیکن تائگ خاندان کے زوال کے ساتھ ہی شاہراہ ریشم کا آرٹ اور تہذیب و تمدن بھی انحطاط پذیر ہو گیا۔ نتیجے میں بدھ آرٹ مذہبی عمارت اور کئی بستیاں ناپید ہو گئیں۔ یہ زوال اس درجہ مکمل تھا کہ تمام آبادیاں اور بودھ تاریخ کا تاب ناک باب چینی و سلطی ایشیا میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ہیڈن اور شین نے ہوتا، میا اور ڈانڈن کے مقامات سے آرٹ کے جو نمونے ملاش اور دریافت کیے ان سے مغرب تو آشنا ہے لیکن قومی عجائب گھروں میں ان کا ہلکا ساسایہ بھی موجود نہیں۔ زمانے کی ستم ڈریفی یہ ہے کہ یہ تک اعتراف کرنے والے موجود نہیں ہیں کہ جنہوں نے تہذیب و فن کے کمال پر پہنچ کر زوال دیکھا۔ تیسری صدی کے اوآخر تک نیا کی بستی اجز پچھی تھی جب کہ بعض تختستان اس کے بعد تک بھی آبادر ہے۔ ان کے تادیر قائم رہنے کا ایک سبب یہ تھا کہ انہیں پانی میسر رہا۔ ۹ دیں صدی میں مغرب کی جانب سے عربوں نے حملہ کیا۔ اس میں کئی راہب مارے گئے۔ آبادیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پرانے معبد، راہب خانے اور خانقاہیں ریت میں دب گئیں۔ بالآخر پندرھویں صدی میں مگ خاندان نے مغرب سے تجارت منقطع کر دی۔ تجارتی راستے بند ہو جانے کے سبب سے پیروں اثرات پر دروازہ بند ہو گیا۔ تکلا مکان کے گرد کی تجارتی چوکیاں اور آبادیاں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔ ان کے آثار پر ریت کا دبیز غلاف چڑھ گیا۔ ۹ دیں صدی کے اوآخر تک وہ اسی حالت میں رہے۔ سیوں ہیڈن نے لکھا ہے کہ جب انسانی نظروں سے اچھل ہو جانے والے

یہ آثار دریافت ہوئے تو بے حد دلچسپی محسوس کی گئی۔ جنوری 1896 میں ان گم شدہ بستیوں کی کھدائی کے نتائج سامنے آئے۔ اس وقت تک کسی یورپی کوان کے وجود کا کوئی علم نہیں تھا۔ کسی کے سامنے گمان میں بھی نہیں تھا کہ صحرائے گوبی کے اندر وون میں کبھی کوئی بستی بھی آباد تھی (اس وقت تک صحرائے تکلام مکان کو صحرائے گوبی ہی کا حصہ تصور کیا جاتا تھا) بستیاں جو کبھی ایک پھلتی پھولتی فروغ پذیر تہذیب کے مرکز اور شاہد تھیں ہزاروں برس سے ریت میں دبی ہوئی تھیں۔ میں قدیم لوگوں کی تباہ شدہ آبادیوں کے کھنڈروں میں کھڑا تھا۔ اس شہزادے کی طرح جو کسی جنگل میں پہنچ گیا ہو۔ صحرائے تکلام مکان کے بارے میں جتنی کچھ معلومات میسر آئیں وہ میری آتش شوق کو بھڑکانے اور صحرا کی پہنائیوں میں اتنے پر آمادہ کرنے کی محک ہوئیں۔ کسی اور کو اس صحرا کو عبور کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ صدیاں بیت گئی تھیں لیکن مجھ سے زیادہ باہم بہت ماہرین آثار قدیمہ نے اس طرف توجہ کیوں نہیں کی؟ میرے شبہات کو یہ سوچ کر تقویت ملی کہ اس مہم کو ناممکن جان کر کسی نے اس کا آغاز کرنے کی جرات ہی نہیں کی۔ میرے ان شبہات میں اضافے نے مجھے ناممکن کو ممکن کر دکھانے پر اکسایا۔ میں نے ان سیاحوں کے احوال پر ایک نظر کی جنہوں نے عرب کے ربع سکون میں اتنے کی جرات کی لیکن ناکام رہے۔ میں جانتا تھا کہ میں بڑام تھامس، فلمسی یا تھیسی گر نہیں لیکن مجھے جو سرسری معلومات حاصل تھیں، ان کی بنا پر سمجھتا تھا کہ یہ مہم مشکل ضرور ہے لیکن اسے شروع کرنا اور انجام تک پہنچانا، ناممکن نہیں۔ پھر مجھے یہ بھی علم تھا کہ اگر مہم ناکام رہی تو اس کے اثرات اور نتائج پہلے کی مہمات کی ناکامی سے پیدا ہونے والے اثرات اور نتائج سے چندال مختلف نہیں ہوں گے۔



باب 2

منصوبہ بندی

لندن سے رات کو دچھرے جانے والی ترین میں سفر کے دوران میں میں انہی خیالوں میں گم رہا۔ یہ ستمبر 1993ء کی بات ہے۔ ایک ہفتہ بعد ہمیں چین کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ ہم نے سفر کا منصوبہ بنانے میں انہارہ ماہ صرف کیے تھے۔ ہمیں چین پہنچ کر کس نوع کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خاص طور پر وہاں کی افسرشاہی سے کس طرح نمٹا جائے۔ اس کا ہمیں کوئی واضح خیال نہیں تھا۔ بہر حال اب ہمارے لیے پیچھے ہٹنے اور واپس جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اپنے بریف کیس سے اپنی وسیت نکالی۔ اس میں کچھ ترمیم کرنے کی ضرورت تھی۔ میرا تیرا پیٹا تو بائی ابھی صرف چار ماہ کا ہے۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں کیا سوچے گا، جس نے صحرائے چکلامکان کو عبور کرنے کے شوق میں اپنی جان گنودادی۔ میرے چار سالہ بیٹے جیک اور چھ سالہ اولیور کا کیا ہو گا؟ اولیور ایک روز اپنی ماں اور میرے ساتھ کھڑا تھا کہ ایک صحافی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں اس پر خط سفر پر کیوں روانہ ہو رہا ہوں؟ میں کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا کہ اولیور کی آواز گوئی، ”ماں مجھے سمجھنہیں آ رہا کہ ڈیڈی صحرائیں کیوں جا رہے ہیں؟“

میرا ذہن، ہم کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن میں نے اس سفر کے ضمن میں اپنی ذاتی اور عملی مشکلات کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ اگر میں زندہ نہ بچا اور میری میت دریافت کر لی گئی تو اسے میرے وطن بھیجا جائے گا؟ کیا اسے

کلمسن کے قبرستان میں پر دخاک کیا جائے گا۔ یا ہپشار گاؤں میں دفن کیا جائے گا، جہاں ہم نے پانچ برس تک قیام کیا تھا اور جہاں میرے تینوں بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ یامیون کی وادی میں، جہاں حال ہی میں جا بے تھے۔ وہاں ہمارا جو گھر ہے میرے بیٹے اس کے بیڈروم سے اُس جگہ کا نظارہ کر سکیں گے جہاں میری قبر بنے گی۔ وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں یہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ ان کے باپ نے آخر کس مقصد کے لیے قربانی دی! میری مہم کی ناکامی کی یہ قیمت ادا کرنا کس حد تک روا ہوگا۔

نکلام کان کے بارے میں جو تفصیلی معلومات حاصل ہو سکیں، وہ سیوں ہیڈن کی فراہم کردہ تھیں۔ اس نے مغرب سے مشرق کی طرف کا صرف 200 میل کا سفر کیا تھا۔ جب کہ مجھے چھ سو میل کا سفر کرنا تھا۔ سیوں ہیڈن نے یہ سفر کوئی ایک سال پہلے کیا تھا۔ اس دوران میں صحراء میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مجھے بالآخر تسلیم کرنا پڑا کہ ہمیں اس سفر میں ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جو سیوں ہیڈن کو پیش آئی تھیں۔ سفر کے آغاز پر مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ میں اپنے خاندان کو کس حال میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے پچے، میری عدم موجودگی میں پھیں بڑھیں۔

میرے والد نیپال میں، ہمالیہ کی مشرقی لڑائی میں ہلاک ہوئے تو اس وقت میری عمر 19 برس اور میرے بھائی کرسٹوفر کی تین برس تھی۔ وہ ایک گورکھار جنٹ کے ساتھ مسلک تھے۔ ان کی وفات دل کی حرکت بند ہو جانے کے سبب سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر 49 برس تھی۔ میری ماں فارفالک میں ایک فارم ہاؤس میں رہتی تھیں۔ یہ فارم ہاؤس ہم نے کچھ ہی عرصہ پہلے خریدا تھا۔ میرے باپ فوج سے وابستہ ہونے کے سبب سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لیے اپنا مکان خریدا تھا۔ میرے باپ خوش تھے کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ اپنے مکان میں بچوں کے ساتھ رہ سکیں گے۔ مجھے جو حالات درپیش تھے، ان کے سبب سے باپ سے فرقہ کا رخ قدرے کم ہو گیا۔ لیکن جب بھی خیال آتا دکھ محسوس ہوتا۔ دکھ درد کا یہ سلسلہ آنے والے برسوں میں بھی قائم رہا۔

ایک گورکھار جنٹ کے ساتھ میری تعیناتی دو سال کے لیے ہاگ کا گنگ

میں ہو گئی۔ اس کے ایک ماہ پہلے میری شادی ٹینا سے ہو گئی۔ میں اسے نیپال، اپنے باپ کی قبر دکھانے لے گیا۔ قبر دھارن میں ہے۔ ہم وہاں کھڑے روتے رہے۔ مجھے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ ہم زندگی کی خوشیاں باہم باش نہ سکے۔ وہ میری بیوی ٹینا سے نہل سکے اور اپنے پہلے پوتے کو نہ دیکھ سکے۔ مجھے اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہوا۔

اس رات جب میں ٹرین میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا، مجھے بار بار خیال آتا کہ آیا ٹینا اور بچے سوچ پائیں گے کہ صحرائیں میرے لیے کیا ہے؟ پہلی مرتبہ مجھے ڈرمیسوں ہوا کہ صدیوں کے دوران میں صحراء ب تک جانے کتنے ہزاروں کی جانیں تلف کر چکا ہے۔ میرا منصوبہ ابھی خام تھا، جزیات طے نہیں ہوئی تھیں۔ میں صحرائی نامعلوم اور وحشت ناک طاقت کا سوچ کر لرز گیا۔ ہمارے منصوبے کا تمام تر مدار سیبوں ہیڈن اور ٹین کے تجربات پر تھا۔ ان تجربات کو دیکھتے تو پیش آنے والی مشکلات میں کئی گناہ اضافہ ہو جاتا۔

سفر شروع کرتے وقت میں نے سوچا تھا کہ مجھے بھی ہیڈن اور ٹین کی طرح اس مہم پر اکیلے ہی لکھنا چاہیے۔ میں دو تین افراد اونٹوں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ لے لینے چاہیں۔ لیکن جلد ہی محسوس کر لیا کہ میرے اندر اتنی طاقت اور اخلاقی جرأت نہیں کہ اس نوع کے مشکل اور صبر آزماء مرحلے سے تنہا گزر سکوں۔ سو فیصلہ کیا کہ چار افراد ساتھ ہوں گے۔ ان میں سے ایک طبی امداد فراہم کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ ایک ریڈیو آپریٹر ہو گا، ایک رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا، ایک فوٹو گرافر ہو گا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس امدادی ٹیم کی مدد کے بغیر اتنا طوفانی اور پُر خطر سفر کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اب پہلا مرحلہ موزوں افراد کے انتخاب کا تھا۔ ایسے افراد کا جو میری مہم کو جاری رکھنے اور نتیجہ خیز بنانے کے پوری طرح اہل ہوں۔ جہاں تک ضروریات کی فہرست مرتب کرنے کا معاملہ تھا تو اسے آسانی کے ساتھ نہیں ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس منصوبے کے شروع کرنے سے لے کر انجام تک پہنچانے میں مختلف ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کم و بیش 4 لاکھ پونڈ درکار تھے۔ برطانوی اور چینی حکام مجاز سے اجازت چاہیے تھی۔ کلام مکان سے متعلق جتنی بھی میسر معلومات تھیں، فراہم

کرنا تھیں۔ چین اور رائل جیوگر فیکل سوسائٹی اور اس طرح کے دوسرے اداروں کی نظری رہنمائی سے مستفید ہونے کی ضمانت چاہیے تھی۔ منصوبے کے تعلق میں، مختلف کمپنیوں کی سرپرستی اور امداد کا حصول الگ اہمیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے جس شخص نے میرے منصوبے میں دلچسپی کا اظہار کیا وہ برلنے والٹ سپر تھا۔ وہ بلیوز اینڈ ریٹائلز میں افسر تھا۔ یہ دونوں فوج کا حصہ تھے۔ والٹ نے سینڈھرست اور شناور کالج میں تربیت حاصل کی تھی۔ وزارت دفاع میں اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ میرے دفتر میں آیا اور اس نے دریافت کیا کہ کیا یہ کوئی فوجی منصوبہ ہے۔ میں نے بتایا کہ اس کا فوج سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میرا اپنا منصوبہ ہے۔ میں نے ہی بتایا ہے اور اسے انجام دینے کا قصد کیا ہے۔ اس کے لیے تم کہاں جاؤ گے۔ اس نے دریافت کیا۔ مجھے یہ ہم چین میں ہی رکھ کر شروع کرنا ہے۔ اس نے پوچھا کہ کون سا صحراء ہے؟ میں نے بتایا نکلا مکان۔ اس نے کہا کہ اس نے پہلے تو اس کا نام کبھی نہیں سن۔ کیا تم اکیلے جاؤ گے۔ میں نے کہا، نہیں ہم آٹھ افراد ہوں گے۔ ان میں سارے بان ہوں گے۔ میں کے قریب اونٹ ہوں گے، سب کے سب اونٹ دو کہاں والے ہوں گے۔ میں نے اسے علاقے کا نقشہ دکھاتے ہوئے بتایا کہ ابتدائی دو سو میل کے سفر کے دوران میں ہمیں وقف و قفے سے ضروری ساز و سامان ملتا رہے گا۔ یہ ابتدائی منصوبہ ہے۔ فارن آفس اور چینی حکام سے اجازت لیتا باقی ہے۔ باری بولا میری ہمیشہ سے شاہراہ ریشم پر سفر کرنے کی خواہش رہی ہے۔ میں بھی آپ کی ہمیں میں شریک ہو سکتا ہوں۔ اس کے ابتدائی مرحلے میں دیکھ بھال اور ٹگرانی کے فرائض انجام دے سکوں گا۔ میں نے محسوس کیا کہ باری کا ارادہ پختہ ہے، وہ سفر کے ابتدائی صبر آزم مرحلے میں مفید کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہ میرے نائب کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالنے اور بھانے کے اہل ثابت ہوا، اس کے مشورے صحیح ہوتے اور ہر الجھن کو سلبھانے کے کام آتے۔ وہ نہایت متحمل مزاج تھا۔ ہر کام خاموش اور سمجھدگی سے کرتا۔ اسے اپنے عمر بھر کے دوست لارڈ فرانس سیمور کا ساتھ دینے کی تمنا تھی۔ اس کی عمر 36 برس تھی۔ وہ ہم میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اس سے کیا کام لے سکتا ہوں۔ بعد میں

جب وہ مجھے گھر چھوڑنے گیا تو میں نے اس کے لباس اور اس کی حرکات اور دیکھنے کے انداز کا مشاہدہ کیا۔ وہ کچھ کرگزرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس کے پختہ عزم وارادے کی پہنا پر میں نے محسوس کیا کہ وہ شہر کی تنقینائی سے نکل بھاگنے کے کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ دوسری صبح ہماری ملاقات رائل ہارس گارڈز ہوٹل میں ہوئی۔ میرے کئی ائٹرو یو میٹیں ہوئے تھے۔ اس نے کافی پینے سے معدرت کر لی اور میری ہم سے متعلق قائلیں دیکھنے اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ میرا منصوبہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ اسے کیا کام کرنے ہوں گے۔ اس کی ذمہ داریوں کی نوعیت کیا ہوگی۔ میرے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا کہ اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے یقین ظاہر کیا کہ میرا منصوبہ قبل عمل ہے۔ اس نے باری کے نائب کی حیثیت سے آلات و سامان کی نقل و حمل اور پیغام رسانی کی ذمہ داری سنپھال لی۔ موسم گرم کے اواخر میں رینولف فینس کی کتاب ”ایٹلانش ان دی سینڈز“ کے بارے میں ایک تعارفی تقریب میں میری ملاقات کیرو لین ایلیس سے ہوئی۔ وہ خوش ہنگل، ہم جو اور بے حد خود اعتماد تھی۔ اس کے سیدھے سادے سجاہ اور دل نشیں ہنسی نے مجھے متاثر کیا۔ اس نے وہ برس تک رائل آرمی نرسنگ کو رہیں افرکی حیثیت سے خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس نے خلیجی جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو طبعی معاملات میں شدید پدھر رکھتا ہوا اور ہمارے سفر کے دوران میں پیش آئے والے شداید کا موثر علاج کرنے کا اہل ہو۔ سفر شروع کرنے کے دن تک میں سوچتا رہا کہ آیا صحراء عبور کرنے کی ہم میں کسی عورت کو شامل کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ اس کی جسمانی صلاحیت، توانائی اور مشکلات کا سامنا کرنے کی الہیت کے بارے میں کوئی شہہر نہیں تھا، لیکن اتنے مردوں کے ساتھ ایک عورت کا ہم سفر ہونا کئی طرح کی قابوتوں کا موجب ہو سکتا تھا، جو پوری ہم کی ناکامی کا سبب بن سکتا تھا۔

میری بیوی کے الگ شہہرات تھے، اس نے ایک پوسٹ کارڈ پڑھ لیا تھا۔ جس میں کیرو لین نے مجھے ”بہت ہی پیارے چارلس“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ ”میں صحراء اور اسے عبور کرنے کی ہم میں نہیں، ہم کے تیز طرار اور خوب صورت لیڈر کے بارے میں سوچتی رہی ہوں اور رات بھر سو نہیں سکی۔ آپ کی تواضع کے لیے شکر یہ

اور بے حد و حساب محبت۔ کیرولین، میں یہ خط میز پر رکھ کر بھول گیا تھا، میری بیوی ٹینا، ان دنوں حاملہ تھی، میں اتنا جانتا تھا کہ اس حالت میں عورتیں شکوک و شہرات کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں کیرولین کو یہ نہ بتا سکا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ٹینا نے بڑے تنگ لبجے میں کہا کہ ”یہ سب کچھ کیا ہے؟“ اور کہا کہ ”آپ اسے (کیرولین کو) اپنے ساتھ صحراء میں نہیں لے جا رہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، ایسی کوئی بات نہیں میں نے ٹینا کو یقین دلانے اور باور کرنے کے لیے کہ اس کا شک بے نیاں ہے، ہر حیلہ آزمایا، لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ بہر حال میں نے مہم پر جانے کی تیاری جاری رکھی۔

جو دوسرا شخص ہماری مہم میں شامل ہونے آیا، وہ 25 سالہ فوٹو گرافر لیکھ ستر تھا۔ میری اس سے نومبر 1992 میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پہاڑوں کی فوٹو گرافی پر ایوارڈ لینے لندن گیا تھا۔ وہ لمبا تر ٹنگا، خوب صورت اور خوش مزاج جوان تھا۔ میری مہم جوئی کے پیش نظر میرے لیے احترام کے جذبات رکھتا تھا۔ باری، فرانس اور میں ہمہ وقت مہم کی تیاری میں مصروف تھے۔ جب ”ائز پرائز آئل“ نے ہماری سرپرستی کرنے کی حاوی بھری تو اس وقت تک نہ تو ہم نے کوئی دفتر قائم کیا تھا نہ ہمارے پاس ٹیلی فون تھا۔ نہ فنڈ اکٹھے کرنے کے لیے ضروری کاغذی کارروائی کی تھی۔ اتنی بڑی مہم کے لیے جس وسیع پیمانے پر تیاری کی ضرورت تھی، اس کی جزئیات تک طے ہونی چاہیں تھیں لیکن ہم نہیں کر سکے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرتا، ٹیلی فون کاں سننا، فیکس بھیجننا، خط ٹاپ کرنا اور اسی طرح کے دوسرے دفتری کام بس لشمن پشتم ہی ہو رہے تھے۔ اس میں کوئی نظم اور ضابطہ نہیں تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ اب تک جو کچھ کیا یا سوچا تھا، اس پر پانی پھر نے والا ہے۔

ایسے میں بیلا برڈوڈ نے ہماری ڈھارس بندھائی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ہمارے لیے سرمایہ جمع کرنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ البتہ خط کتابت اور عام تنظیم کے سلسلے میں معاونت کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس نے ہماری سرپرستی کرنے والوں اور مہم کے ارکان کے لواحقین سے بات چیت کرنے کی ذمہ داری سنپھال لی۔ وہ انہیں باقاعدگی سے باخبر رکھنے لگی۔ اس اعتبار سے وہ ہماری مہم کی ترجمان بن گئی تھی۔ وہ اس

انہاک سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی کہ کبھی بھار اسے شگ گزرتا کہ یہ کمٹھن ذمہ داری نہ جانا، اس کے بس میں نہیں۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو اس کی بہت اور طاقت جواب دے جائے گی۔ ایسے میں اس کے شوہر چارلیٹ بیٹ ہل نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کا بوجہ بانٹا اور مہم کی تشویش کے لیے پریس کانفرنس کرنے اور لوگوں کو مہم کی اہمیت کو باور کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ وہ مہم کے لیے سرماۓ کی فراہمی سے لے کر چینی میزبانوں کے لیے تختے تھائے جمع کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ چارلیٹ مہم کے حسابات بھی رکھنے لگا۔ وہ اپنے کام کے لیے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ سارا کام کسی اجرت کے بغیر کرتا تھا۔ اس کی اس بے لوٹی اور بے غرضی نے ہماری مہم کا آغاز کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

1992 کے موسم سرما اور 1993 کے اوائل تک باری، بیلا، فرانس اور میں نے مہم کی تنظیم کا کام مکمل لیا اور اس کے شروع کرنے کے لیے ستمبر 1993 کی حد مقرر کر لی۔ ہم ہر پندرہ روز کے بعد ملتے۔ اس وقت تک ہونے والے کام کا جائزہ لیتے۔ یہ ملاقات کبھی کسی کے اور کبھی کسی کے گھر ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ باری اور فرانس کی بیویاں مواد پیدا شام کا کھانا پکائیں جو ہمارے مباحثوں کے دوران میں کھالیا جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ بے دھیانی کے عالم میں ہوتا۔ کسی کو برلن سنبھالنے اور ڈھونے کی نگرانہ ہوتی۔ ناچار دونوں بیگناں ہمیں کسی دوسرے کمرے میں جا بیٹھنے کا کہتیں اور خود میز صاف کرنے میں لگ جاتیں۔ رات بھر کام کرتے رہنے سے ہمارے جسم تھکن سے چور ہو جاتے۔ صبح ہونے کے قریب ہم اٹھتے اور اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ جو تفصیلات طے ہونے سے رہ جاتیں وہ اگلی ملاقات پر اٹھا رکھی جاتیں۔ کام زیادہ اور وقت کم تھا۔ میں کبھی محسوس کرتا کہ دریا کے اٹھ رُخ تیر رہا ہوں۔ دریا کا بہاؤ تیز ہے اور میرے بازو کمزور ہیں۔ جانے کب ہاتھ پیر پھول جائیں اور میں تند و تیز رُد میں بہہ جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ ہم ہر بات بڑی تفصیل اور وضاحت سے طے کر رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو جس مہم پر نکلے ہیں، اسے کبھی سر نہ کر سکیں گے۔ ہماری بقا کا انحصار اس پر تھا کہ تمام انتظامات مکمل اور بے عیب ہوں۔ بہر حال کوئی ایک مصیبت نہیں تھی۔ ہم جنمیں سرپرستی کے لیے کہتے ان میں سے اکثر و

پیشتر کا ایک سا جواب ملتا۔ ”اس موقع پر ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے، ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنے منصوبے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوں۔“

اس طرح کے خطوط میرے لیے پیشیاں اور ہمت ٹھنڈی کا موجب ہوتے۔

وائراءے ہند لارڈ کرزن اور برٹش میوزم نے جس آسانی اور مہربانی سے شین کی مدد کی تھی، اس کا حال جان کر مجھے سخت ہزیرت کا احساس ہوتا۔ ہیڑن کو سویڈن کے بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ جب اپنی مہم پر نکلنے تھے تو انہیں روپے پیے اور سازد سامان کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہ زمانہ بیت گیا۔ جن لوگوں کو ہمارے منصوبے سے اختلاف تھا وہ اسے ناممکن لعمل کہتے۔ ایک اور مشکل یہ آن پڑی کہ وزارت دفاع کی سول سروں شاخ کسی ایسی مہم کی مدد کے لیے تیار نہیں تھی۔ جس میں فوج کے افراد شامل ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ چینی اس مہم کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ایک مہم جسے برطانیہ کی فوج کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو اس کے بارے میں منقی پر اپنے گزرا ہو سکتا تھا۔ بھی پوچھا جاتا کہ اس مہم سے برطانوی فوج کو کتنا اور کیا فائدہ ہو گا؟

اس دوران میں مجھ پر دباؤ بڑھتا گیا۔ ہکلا مکان کو عبور کرنے کا منصوبہ اپنے اندر کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلات لیے ہوئے تھا کیوں کہ اس کی معنویت کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ اس کی حیثیت معنے سے کم نہ تھی۔ منصوبے پر صحرائیں عمل درآمد کے دوران میں ناکامی کا امکان کم لیکن مہم شروع کرنے کے لیے جن اجزا کو باہم مریبوط کرنا لازم تھا، وہ ایک دوسرے سے لگا کھاتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ناکامی کا سبب میری اپنی ناقص منصوبہ بندی دکھائی دینے گی تھی۔ میں نے اسے بے سبب پھیلدا دیا تھا۔ میں نے فوج میں چودہ برس گزارے تھے۔ جس مہم پر نکلنے کا قصد کیا تھا اسے ہم نوع تضادات سے بچانے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ فوج سے استعفی دے دیتا اور اپنے لیے نئے امکانات کی جتو کرتا۔ اس ضمن میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ یہ واضح نہیں تھا۔ اس دوران میں میٹنا نے تیرے میٹے کو جنم دیا۔ میری ماں کو چھاتی کا کینسر تھا جو بگڑتا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چار مہینے کے لیے چین جانے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی ماں کو دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔

میرے معاملات تبدیلیوں کی زد میں تھے۔ بے یقینی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ دباؤ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود میں اس خیال سے دامن نہ چھٹرا سکا کہ مجھے طے شدہ مہم پر نکلنا چاہیے اور جسے ناممکن کہا جا رہا ہے اسے ممکن کر دکھانا چاہیے۔ میرے اندر ایک جنگ اور کش مکش جاری تھی۔ کئی بار سوچا کہ صحراء میں جانے اور نئی آزمائشوں میں پڑنے کو چھوڑ دوں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا کہ جو چیز درپیش ہے، اسے قبول کر کے اور مہم جوئی کی مشقتیں جھیل کر ہی ثابت نہائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میں میدان میں نکلوں گا تو جبھی اپنے جو ہر آزماء اور داد پا سکوں گا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس مہم میں میری جان چلی گئی تو اسے رایگاں نہیں سمجھا جائے گا۔ میں نے بچوں کے لیے کینسر کا فنڈ جمع کرنے کو مہم کا مقصد قرار دے دیا۔ اس اعتبار سے نکلام کی تحریر ایک اہم مقصد کی تکمیل کا وسیلہ ثابت ہو سکتی تھی۔ آکسفروڈ یونیورسٹی نے اس سلسلے میں ہماری معاونت کرنا شروع کر دی۔ اسے ریت کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں پیش آنے والے مرحل کا مطالعہ کرنے میں دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ صحراء کی لمبائی اور دوسرے کوائف کا علم حاصل کرنا مقصود تھا۔ بالآخر برٹش میوزیم اور برٹش لائبریری نے بعض پرانے مقامات سے مختلف بنیادی نوعیت کی معلومات کی فراہمی میں دلچسپی دکھائی۔ یہ مقامات شاہراہ ریشم کے قریب واقع تھے۔ ان کے علاوہ صحراء میں شہابیوں کی موجودگی کا بھی پتا چلانا تھا۔ جنگلی گھوڑا جو ایک سو برس پہلے صحراء کے نواح میں موجود تھا، اس کی باقیات کے بارے میں معلومات مہیا کرنا تھا۔ ہمیں اس ضمن میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی اور ڈیوک آف ایئنبرا کی حمایت حاصل ہو گئی۔ اب ہمارے لیے کرشل اداروں کی تائید و حمایت حاصل کرنا آسان ہو گیا۔

جون 1993 میں صحراء کو عبور کرنے کی مہم شروع کرنے سے تین ماہ پہلے میں چین گیا اور اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے چینی حکام کی مدد چاہی۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے مارک کو اپنے ترجمان کے طور پر ساتھ لیا۔ وہ اور میں دونوں فوج میں افسر تھے۔ ہم دونوں نے ہی ایک کمیونٹی ملک میں جانے کے لیے اجازت نہیں لی تھی۔ بہرحال میرا جانا اور بعض معاملات طے کرنا ضروری تھا۔

مارک و پلش گارڈز کے ساتھ شہابی آئرلینڈ میں تعینات تھا۔ اس کا عہدہ کیپٹن کا تھا۔ سکول کے ایام میں اس نے چینی زبان لیکے لی تھی۔ اس کی عمر 26 برس تھی۔ اس کے عادات و اطوار جیسے بڑوں سے ملتے تھے۔ جس نے میری پہلی دو مہینوں میں میرا ساتھ دیا تھا۔

بینگ میں ہم دونوں کو ایک پرانے روی جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ یہ جہاز چین نے قازقستان ایروپر سے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اسے ایک چینی پائلٹ چلا رہا تھا۔ اس کا عملہ روی تھا۔ لیکن عجب انہل بے جوڑ، ہم پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے سنیا گکے دار الحکومت ار پی چینی پہنچے، یہاں ہم ان حکام اور پیپلز لبریشن آرمی کے ان افران سے ملے جن کے توسط سے شاہراہ ریشم اور قریب کے علاقے میں پہنچنے کے لیے ضروری پرست اور کاغذات حاصل کیے جاسکے۔ ہکلا مکان تک پہنچنے کے خیال نے ہمارے خون کی گردش تیز کر دی۔

جیسے ہی ہم جہاز سے اترے، ہمارے چینی میزبان ہمیں ایک پُر تکلف دعوت میں لے گئے۔ جہاں ہماری بڑی خاطر مدارات اور تواضع کی گئی۔ اس کے بعد ہمیں ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ بات چیت کا آغاز اگلی صبح کو ہو گا۔ ہم تین روز ہوٹل کے کمرے میں بدمزہ چینی سگریٹ اور سبز چائے پیتے رہے۔ سنیا گکے حکام سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کھڑکی کے باہر دیکھتے تو چینی کارکن فیکر یوں میں آتے جاتے یا پھر سرخ پرچم کے سامنے ورزش کرتے نظر آتے۔ عمارتیں یکسانیت کا شکار ایک سی تھیں۔ سڑکوں پر ہارن بجاتے، چھکڑا ٹرک دوڑتے اور چینی کارکن سائیکلوں کی گھنٹیوں سے شور چاتے گزرتے۔ شہر پر دھوئیں اور دھنڈ کی چادرتی تھی۔ ہمیں صحرا کے قریب جانے کے وقت کا علم تھا اور نہ ہی اجازت تھی۔

ہمارے ساتھ گفت گو پر ٹریوں کمپنی کا سینٹر افسر گیو جن واٹی مامور تھا۔ میرا ایک سال سے اس کے ساتھ فیکس کے ذریعے رابط تھا۔ میں پہلے اس سے ایک بار اس وقت ملا تھا جب وہ کسی سرکاری کام سے لندن آیا تھا۔ اس کا چین سے باہر کا پہلا دورہ تھا۔ اس سے میرا رابطہ ایک دوست کے حوالے سے ہوا تھا۔ جس کی سنیا گک میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے وزارت دفاع کے قریب کے ایک ہوٹل میں اس کی

دعوت کی تھی۔ میں اور گیو نے صحراء کو عبور کرنے کے عملی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ خاص طور پر یہ طے کیا کہ ہمارے بعد آنے والی ٹیم ہم سے کب اور کہاں آنے لے گی۔ میں نے صحراء کو عبور کرنے کے لیے مغربی کنارے سے لے کر مزار تناغ تک کا راستہ چنا۔ یہ 210 میل لمبا تھا۔ مزار تناغ سے آگے ناگ گوز بستی تک مزید 90 میل کا سفر کرنا پڑتا۔ یہ چواہوں کی بستی تھی۔ اس سے آگے کا سفر نہایت دشوار تھا۔ صحراء کے مشرقی نصف حصے میں دو پرانے دریاؤں کی خلک گزر گاہیں تھیں۔ جنوب کی طرف سے ان کے راستے ساٹھ میل تک کا سفر کیا جا سکتا تھا۔ ناگ گوز بستی سے لیو بُر ہوا نگ تک کا فاصلہ 400 میل تھا۔ جس میں ہمیں کم سے کم ایک بار مزید سامان رسد در کار ہوتا۔ اس سفر سے متعلق کسی قسم کی تفصیلات میر نہیں تھیں۔ چینیوں نے شین اور ہیڈن کے سفر سے متعلق صرف سنا تھا یا سرسری سی معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ مختلف مقامات پر رسد کی فراہی لازمے کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے بغیر سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہمارا سفر اور اس سے متعلق جو کچھ انتظامات کیے جاسکتے تھے، قیاس پر بتی تھے۔ میں نے مشرق و سطی میں اوپنیوں پر سفر کیا تھا۔ بس اسی کی معلومات موجودہ سفر کا ذریعہ تھیں۔ غرض قدم قدم پر مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنے اور ہم کے ناکام رہ جانے کا امکان، سخت مایوس کن تھا۔ چینی ہماری ہم کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ موت کے صحرائیں کسی راستے اور موثر سہارے کے بغیر یہ ہم کیسے جاری رکھی جاسکے گی۔ قدم قدم پر خطرہ تھا۔ امید اور کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ بس ایک آسرا تھا، اور وہ تھیں انگریزوں کی وہ ہمیں جو بے سرو سامانی کے عالم میں کی گئیں اور بے پناہ مشکلات کے باوجود کامیاب رہیں۔

اگلی صبح کو گیو نے منصوبے کا چینی خاکہ پیش کیا۔ اس کے رویے سے ظاہر تھا کہ اگر ہمیں اس خاکے سے اتفاق ہے تو ارچی میں قیام کے دوران میں کچھ سیر کی جا سکتی ہے۔ ہم نے محسوس کر لیا کہ چینی اس فکر میں تھے کہ اس ہم کے نتیجے میں انہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ہماری ہم کی کامیابی کا بیشتر انحصار چینیوں کے تعاون پر ہے۔ کیوں کہ ماضی میں کئی بین الاقوامی ہمیں چینیوں کے عدم تعاون کے سبب سے ہی ناکام ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب جس گفت و شنید میں ناگواری پیدا ہوئی اور

چینی اپنے مطالبے میں کمی کرنے سے انکار کرتے تو میں داؤ کھیلتا اور انہیں سرایلڈ ورڈ پیٹھ کا وہ خط دکھاتا جو انہوں نے صوبے کے گورنر تیمور دوامت کے نام لکھا تھا اور انہیں نکلام مکان صحراء کو عبور کرنے کے برطانوی اور چینی مہم کا ڈائریکٹر بننے کی دعوت دی تھی۔ چینی گفت گو میں بڑے سخت تھے۔ کسی طرح کی چلک دکھانے پر تیار نہ ہوتے۔ ہمیں پورا دن الجھائے رکھتے اور یہ مشکل پانچ منٹ کے لیے سانس لینے کی مہلت دیتے۔ جب بھی دعوت کا اہتمام کرتے اس میں ہم پر اتنا دباؤ رکھتے کہ ہمارے اعصاب جھنجھنا اٹھتے۔ لیکن ہم اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے۔ بالآخر چار روز بعد چینی سے واپس روانہ ہوئے۔ ہم بالغی طور پر مطمئن تھے کہ ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ ہم مہم کے مصارف کم کرانے اور منصوبے کے بارے میں معاهدہ طے کرنے میں کامیاب رہے۔ دو معاملات طے کرنے میں خاصی مشکل پیش آئی، تاہم طے پا گئے۔ ایک تو ریڈیو کے ساز و سامان کی فراہمی اور دوسرا سامان کی نقل و حمل کے انتظام سے متعلق تھا۔ سفر شروع کرنے میں تین ماہ رہ گئے تھے۔ ہم پر اٹھنے والے خرچ میں کمی ہو گئی۔ دوسرے ہم کے معاملات میں چینی افسروں کی مداخلت کا سد باب ہو گیا۔ اس بات پر اتفاق کر لیا گیا کہ دو چینی ہم کے ساتھ رہیں گے۔ بعد میں ان کی تعداد بڑھا کر چار کر دی گئی۔ انہیں باری کی ٹیم کے ساتھ شاہراہ رویش پر رکھا گیا۔

ارجمند میں قیام کی آخری سہ پہر کو ہم نے پیپلز ہال میں گورنر کی ضیافت میں شرکت کی۔ میں نے ”موت کے صحراء“ کو سرا اور عبور کرنے کی برطانوی اور چینی مہم کا تذکرہ کیا اور اپنی زور دار تقریر میں کہا کہ ”ایک تیکی کوتاؤ آسانی سے توڑا جاسکتا ہے لیکن ان کے گٹھے کو توڑنا محال ہوتا ہے۔“ میں نے اپنی تقریر کا مارک سے چینی میں ترجمہ کرایا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم صحراء کو مستخر کرنے کی مہم میں مل کر شرکت کریں گے۔ سامنیں نے میری تقریر پر بڑی واہ وا کی اور زور زور سے تالیاں بجا کیں۔ میں نے کہا نکلام مکان کا معنی یہ ہے کہ اس صحراء کے اندر جانے والے، بھی زندہ سلامت واپس نہیں آتے۔ لیکن ہم اسے غلط ثابت کر دکھائیں گے۔ ہم چینی اور برطانوی اکٹھے صحراء میں جائیں گے اور اسے عبور کرنے کے بعد اکٹھے ہی واپس آئیں گے۔ پھر یہ صحراء موت کا صحراء نہیں کہلائے گا۔

ہم جہاز میں ارچی سے بیچنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاز میں برف پوش پہاڑوں پر سے گزرتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ ہمیں چین کا تعاون اور حمایت حاصل رہے گی۔ ہم ہاگ کا نگ کپنچ گئے۔ اب اگلا مرحلہ شروع ہونا تھا۔ یہ ہم کے لیے فند جمع کرنے کا مرحلہ تھا۔ اس ضمن میں ہم نے رچڈ گراہم سے رابطہ کیا۔ وہ سفیرہ چکے تھے۔ قد بت کے چھوٹے اور جسم کے چھریے تھے، مگر ان کی زبان میں بڑا اثر تھا، وہ اپنے مخاطب کو یقین دلا سکتے تھے کہ دنیا میں ایک وہی تو ہیں۔ ان میں بلا کی حسی مزاج تھی۔ نہایت سمجھیدہ گفت گو میں بھی وہ ہنسی مذاق کی پھل جھڑیاں چھوڑتے اور سننے والوں پر چھا جاتے۔ عمر میں وہ مجھ سے ایک برس چھوٹے تھے۔ وہ شنگھائی میں کام شروع کرنے والے تھے اور مشرق بعید میں اپنے مقاصد کے لیے فند کی فراہمی کی غرض سے ہماری ہم میں حصہ لینے پر تیار ہو گئے تھے۔ ہماری ان سے دو دن کی ملاقات رہی۔ اس میں انہوں نے کوئی بارہ میٹنگیں کرائیں تیج میں ہم ہاگ کا نگ کی کپنیوں سے ساٹھ ہزار پونڈ کے وعدے لینے میں کامیاب رہے۔

بعض ہم جو افراد اکثر کہتے ہیں کہ انہیں اصل ہم شروع کرنے سے قبل جو منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے وہ زیادہ اعصاب شکن اور صبر آزماء ہوتی ہے۔ میں نے بھی صحرائے عبور کرنے کے لیے سفر کے آغاز میں اس طرح کا دباؤ محسوس کیا۔ ہمیں سبتر کے اواخر میں ہم شروع کرنے کے لیے اگست کے اوائل میں ہی انگلینڈ سے ضروری سامان اور گاڑیاں حاصل کر لینی چاہئیں تھیں اور چین سے ضروری اجازت لے لینی چاہیے تھی۔ وقت بہت اہم تھا۔ ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سبتر کا مہینہ اس لیے چنان کہ صحرائے گرم کے اواخر کا سامنا کرنا پڑے گا اور سرماء کے شروع تک موسم بڑی حد تک گوارا ہو گا۔ اس سے پہلے کے موسم کو نقطہ آغاز بنایا جاتا تو 120 درجے فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا اور اس میں ہم جل بھختے۔ ہمیں دس بھر کے وسط تک صحرائے باہر نکل آنا چاہیے۔ دس بھر میں ترکستان کی طرف کی برفلی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ جن کا انسانی صحبت پر نہایت برا اثر پڑتا ہے۔ شدید گری اور شدید سردی دونوں ہی مضر ہیں۔ اس لیے ہم نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ موسم کی شدت سے جتنا بچا سکتا ہے، اتنا ہی بہتر ہے۔ گاڑیوں کا مسئلہ حل ہوا تو فرانس آپنچا جس نے دو ہفتوں میں 55 سالہ

جان تھامس سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ تھامس نے اکلیے گاڑی پر صحراء کے پیشتر حصہ کو عبور کر لیا تھا۔ اس کے پاس چھ پہیوں والی ڈیملر گاڑی تھی۔ وہ خود ساختہ اور انفرادیت پسند شخص تھا۔ اس سے ہماری فرانس کے گھر ملاقات ہوئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتا۔ اس کی تفصیل پسندی کے برعکس میرا رو یہ سرسی تھا، کہنی اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ بہر حال وہ ہماری مینگ میں خاموش بیٹھا رہا لیکن جب اس کی دلچسپی کا پہلو آیا تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔ شروع میں مجھے اس کے بارے میں کئی طرح کے شہادات تھے۔ وہ خاصا باوسیلہ تھا۔ اسے گاڑیوں کا بھی علم تھا اور صحراء کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ مہم جوئی میں کوڈ پڑنے کا خواہش مند تھا۔ مہم میں شامل ہونے کی ایک شرط تھی یہ کہ اس کی خوش طبع یوہی اینی بھی اس میں شامل ہوگی۔ وہ پہلے بھی کئی مہموں میں اس کا ساتھ دے چکی تھی۔ اب یا تو اس کی یہ شرط تسلیم کی جاتی یا پھر اس کی گاڑی اور تجربے سے محروم رہنا قبول کر لیا جاتا۔

جان اور فرانس ایک اور گاڑی کی ملاش میں مصروف تھے کہ قسمت نے یادوی کی۔ آسٹریا کے موڑ کار ساز ادارے کے انگریز نمائندے نے ہمارے منصوبے سے دلچسپی لیتے ہوئے ڈیملل کے میلز فیجر سے گات و ک ائرپورٹ پر ہماری ملاقات کر دی۔ بیس منٹ کی اس ملاقات سے ہمیں قرضے پر گاڑی مل گئی۔ اب ہماری توجہ اور تو انائی سرمائے کی فراہمی اور گاڑیوں کو ضروری آلات اور سازوں سامان سے مرخص کرنے کے لیے وقف ہو گئی۔ بعد میں ان گاڑیوں کو ایک کنسٹیٹیشن کے ذریعے کراچی بھجوایا گیا۔ جان اور اس کے بیٹے کیون نے دن رات لگا کر ان گاڑیوں میں کئی تبدیلیاں کی تھیں۔ ان کے پیچھے کی طرف سامان لادنے کی گنجائش پیدا کی گئی تھی اور فرش کے نیچے پانی ڈخیرہ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بغیر سامان کے ایک گاڑی کا وزن تین ٹن ہو گیا تھا۔ جولائی کے آخر میں تھامس کے گھر تربیتی کورس شروع ہوا۔ پارنی اور فرانس کو خیمه کھڑا کرنا نہیں آتا تھا۔ باقی ماندہ افراد کا مدار ہنسی مٹھھوں پر تھا۔ ہماری توجہ کا مرکز باغ کے گرد اگے ہوئے مالٹے کے درخت تھے۔ اس دوران میں کیٹو امدادی جماعتوں کے درمیان ریٹیبلائی رابطے کے لیے ریڈیو کی فریکونسی بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ چھوٹی چھوٹی عملی مشکلات کے علاوہ منصوبہ بندی سے متعلق نت نے

مسئل پیدا ہو رہے تھے۔ کیا گاڑیاں صحرائیں پہنچ پائیں گی؟ اونٹوں پر کتنا پانی لادا جا سکے گا؟ کیا صحرائے وسط سے باری کی ٹیم سے جو 150 میل جنوب میں ہو گی، ریڈیائی رابط قائم کیا جاسکے گا؟ ہم جتنی باتیں کرتے، اتنے ہی شہادات پیدا ہوتے چلے جاتے اور یہ سوال بار بار ابھرنے لگتا کہ کیا ہم اپنی ہم میں کامیاب ہو سکیں گے؟ بہرحال یہ ایک چیلنج تھا۔ ہم میں سے کسی نے وہ کچھ نہیں کیا تھا جو اسے درپیش تھا یا جو اسے کرنا پڑ رہا تھا۔ نقشہ پر ایسے وسیع رقبے دکھائے گئے تھے جن کے پارے میں کوئی تفصیل موجود نہیں تھی۔ ہم نے ہیڈن اور شین کے بیانات ہی پر بعض تفصیلات درج کی تھیں۔ مگر صحرائے عبور کرنے کے لیے جن منازل سے گزرنما پڑے گا، ان کی نشان وہی نہیں ہوتی تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی، کوئی اس طرف گیا جو نہیں تھا۔ ہیڈن اور شین نے کچھ کوائف ضرور بیان کیے تھے۔ لیکن انہوں نے صحرائیں کچھ زیادہ سفر نہیں کیا تھا۔ یہ سارا اعزاب خود ہمیں کو اٹھانا تھا۔ ہمیں کو نادیدہ اور نامعلوم منزلوں تک پہنچنا اور انہیں دریافت کرنے کا اعزاز حاصل کرنا تھا۔ اس قسم کی صورت حال ہم جو اور ہم پسند افراد کو کچھ کر دکھانے کے جذبے کے تحت باہم ملائے رکھنے کا سبب بنتی ہے۔ ہم جوئی کا جذبہ بہت کم افراد کو دیکھتے ہوتے ہیں۔

ہفتہ عشرہ گزر تو ہم نے اپنی ٹیم کو اکٹھا کیا۔ ساز و سامان سے لدی ہوئی گاڑیوں کو سالسری کی تھرل کے قریب لاکھڑا کیا۔ ہمیں ٹیم اور گاڑیوں کی فوٹو ہنپھوانا تھی۔ اسی اشنا میں بارش ہونے لگی۔ سرایڈرڈ ہیتھ بھی پہنچ گئے۔ تصویریں اتریں۔ ہم نے سامان کو از سرفوت تیب دیا اور گاڑیوں کو ساڑھے ہمپٹن کی گودی کی طرف لے چلے۔ جان اور کیوں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ دونوں نے گاڑیوں کو تیار کرنے میں جس مستعدی اور مہارت کا مظاہرہ کیا تھا، میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ وہ کشمکش اور ایکسائز کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتے تھے۔ ہم نے دونوں گاڑیوں میں سے ایک کا نام بیلا اور دوسرا کا تھامس رکھ دیا تھا۔ بیلا کا نام بیلا برڈوڈ کی ستائش کے طور پر تجویز کیا گیا۔ اس پر جو کنٹیز رکھا تھا وہ روڑڈیم جہاز پر منتقل ہو گیا اور وہ اسے لے کر کاچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

گاڑیوں کی حالت اور ان پر رکھے ہوئے سامان دیکھ کر اطمینان ہوتا تھا لیکن

ہمیں ابھی 70,000 پونڈ سٹرلنگ اور چین جانے کی اجازت درکار تھی۔ جہاز سے ریڈیو اور سیمیلاسٹ کے ذریعے پیغام رسانی کے لیے بھی باضابطہ اجازت کی ضرورت تھی جس کا مخفی اس لیے تکلف نہ کیا گیا کہ جہاز کے کراچی پہنچنے تک یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ خیال تھا کہ اجازت حاصل کرنے کے بعد میں پڑے تو مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ آخری تین ہفتوں میں منصوبے کی باقی ماندہ تفصیلات میں الجھے ہونے کے دوران میں ایک مصیبت یہ آن پڑی کہ اپنے گھر کے پچھواڑے کی ناہموار زمین پر سے گزرتے ہوئے میں اپنے دامیں گھنٹے کو دوہرنا کرنا بیٹھا۔ اس گھنٹے کا پہلے دو بار آپریشن ہو چکا تھا۔ اس کے اعصاب کی جگہ کاربن فاگر لگایا گیا تھا۔ اس سے دردو تو ختم ہو گیا لیکن کمر درد دور نہ ہوا۔ میں نے ہڈیوں کے ماہر ڈاکٹر کو جس نے گھنٹے کا آخری پار آپریشن کیا تھا، ٹیلی فون کیا۔ اس نے اگلے روز یا آپریشن کر دیا۔ بے ہوشی کا اثر ختم ہوا تو میں نے ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی کا اثر دیکھا۔ اس نے کہا کہ تم صمرا کو عبور کرنے کی مہم پر نہیں جاسکتے۔ تمہارے گھنٹے کی حالت بہت ابتر ہے۔ ایسی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اگر تم نے اصرار کیا اور چلے گئے تو واپسی پر تمہیں پلاسٹک کا نیا گھنٹا لگوانا پڑے گا۔ میں بے ہوش ڈاکٹر کا اثر یو نے میری بیوی یعنی کوئی میری حالت بتائی اور اس سے کہا کہ وہ مجھے مہم پر جانے سے باز رکھ سکتی ہے تو ضرور رکھ۔ یعنی کہ اندرونی قسم جانتے ہو کہ وہ جب کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو اسے بدلنے پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے صحیح کہا تھا، یعنی مجھے کسی پر ہپتال سے باہر لائی اور کار پر بٹھا کر گھر لے گئی۔ میری ناگنگ پر کوئی سے پاؤں کی ایڑی تک گھر اپلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ آخری پندرہوائیہ میرے لیے ناقابل برداشت آزمائش لایا۔ ٹیم کے آدھے ارکان پاکستان پہنچ چکے تھے۔ منصوبے اور سرمائے سے متعلق کئی سوالات ابھی تک جواب طلب تھے۔ میں لنگڑا کر چل رہا تھا اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ میں گھر میں سیرھیوں سے اوپر کے دفتر میں بیٹھا، نقشوں اور تصویروں کو گھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سفر پر جانے کا خیال رہ کر مجھے مضطرب کرتا۔ چند روز بعد میں لندن پہنچا اور اشنر پرائز آئیل کی طرف سے دیے ہوئے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ روپرٹ نے سارا کام سنجا لایا۔

ہوا تھا۔ روپرٹ کی عمر 31 برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ پیراشوت رجنٹ میں نان کمشنڈ افسر کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ وہ لمبا تر ٹنگا مصبوط آدمی تھا۔ اس کی قوت برداشت اور حسی مزاح نے مجھے متاثر کیا اور میں نے سوچا کہ ہماری ٹیم میں شامل ہوا تو بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہو گا۔ ٹیم کا آخری ممبر پال ٹریشور تھا۔ میں نے اس کی تصویر کشی کی صلاحیت کے پیش نظر اسے ٹیم میں شامل کرنے کے حق میں رائے دی۔ وہ ہماری ہم کے آرٹسٹ کی حیثیت میں چین جانے کا اہل قرار پایا۔ اس نے اپنی بیوی اور دو ماہ کی بیٹی پیچھے چھوڑی۔ ہم میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی پیارا اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا تھا۔ والدین تھے، بیویاں تھیں یا بچے تھے۔ ہم جو خطرہ مول لے رہے تھے اور ہم پر جو ذمہ داریاں تھیں، ان کا باہم کوئی موازنہ نہیں تھا۔ ایک پیاہتا شخص کے طور پر میں نے زندہ بیج کر آنے کو بہت اہمیت دی۔ شاید دوسروں نے بھی دی ہو لیکن یہ میرے ذاتی تاثرات تھے۔ بہر حال ہم نے ناکامی کے نتائج کے بارے میں تبادلہ خیال نہیں کیا۔



باب 3

روانگی

کراچی میں دفتری کارروائی کا آغاز ۹ ستمبر جمعرات کو ہوا جو فرانس جان اور اینی کے لیے تکلیف دہ تاخیر کا سبب بنا۔ یہ ہماری سب سے آگے کی پارٹی تھی۔ اسے کراچی میں گاڑیوں کو کشمکش سے چھپانا اور چین کے لیے روانہ ہونا تھا۔ کاغذات کے بارے میں پوچھ چکھ شروع ہوئی تو طول پکڑتی گئی۔ کراچی میں آٹو موبائل ایسوی ایشن اور میرے گھر ہپشاڑ کے درمیان فیکس آ جا رہے تھے۔ اس مسئلے کا حل تو نکل آیا لیکن اس وقت تک خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ کشمکش کا دفتر بند تھا۔ اگلا جمعہ کا دن تھا، جو پاکستان میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے پیر تک کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹیم کے ارکان کراچی کے ایمیسی ہوٹل میں پڑے اپنی قسمت کو کوس رہے تھے۔ پہلی پارٹی کو ۲۰ ستمبر تک کاشغر پہنچنا تھا اور گاڑیاں اس سے پہلے دہاں موجود ہوئی چاہیے تھیں۔ اوقات کی پابندی لازم تھی۔ فرانس سب سے آگے کی ٹیم کا انچارج تھا۔ اس نے مارک کو جگانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ دراصل مارک نہیں جانتا تھا کہ وہ جمع کا دن تھا جب پاکستان میں کوئی سرکاری یا غیر سرکاری کام نہیں ہوتا۔ بے الفاظ دیگر چھٹی کا دن تھا اس روز صرف نماز ادا کی جا سکتی تھی۔

اگلے پیر کو برتاؤی سفارت کاروں کے صبر کا امتحان تھا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں گاڑیاں شام تک ہماری اگلی پارٹی کو مل گئیں اور وہ پولیس کی گمراہی میں شمال کی طرف روانہ ہو سکی تھیں۔ پولیس کی گمراہی اس لیے ضروری تھی کہ ان دونوں ملک

میں عام بے چینی تھی۔ ایک سو میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ جان کی گاڑی کا بجن جام ہو گیا اور گاڑی کا آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ مارک نے بیلا گاڑی میں نصب سیٹلائٹ کے ذریعے فیکس پر پیغام پہنچوایا جو میرے گھر پہنچا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بجن ناکارہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ نیا بجن اسلام آباد پہنچا جائے۔ ساتھ ہی بتایا گیا تھا کہ مارک اور فرانس چین کی سرحد کی طرف سفر جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سپری، کیون اور بیلا (گاڑیوں کے نام) انگریز نمائندوں اور میں نے آئندہ چار روز انتظار میں گزارے۔ جب کہیں جا کر آسٹریلیا سے نیا بجن سڑک کے ذریعے انگلینڈ پہنچا اور برلن ایرویز کے ذریعے کراچی روانہ کیا گیا۔ یہ خاصا مہنگا سودا تھا لیکن کرنا پڑا تھا۔ کیوں کہ اس کے بغیر ہم کو شروع کرنا اور جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ مارک اور فرانس نے ضروری سامان دوسری گاڑیوں پر منتقل کر لیا تھا۔ انہوں نے باری کو لیے اسلام آباد کا سفر جاری رکھا۔ انہیں تھجراپ کے راستے سنیانگ میں پہنچنے کے لیے آٹھ سو میل کا سفر کرنا تھا۔ وہ دو نشتوں کی گاڑی پر اس طرح سفر کرتے رہے کہ ایک گاڑی چلاتا، دوسرا چھٹ پر بیٹھ جاتا۔

گیسویں وائی ادارے کا ایک رکن انہیں سنیانگ کی سرحد پر ملا۔ کٹنز پوسٹ کے عملے نے انہیں الوداع کہا۔ دوسرے روز وہ کاشغر پہنچ۔ سابق روی سفارتی دفتر کے سامنے ہیڈن اور شین ویبل پہلے سے موجود تھے۔

جس روز پہلی پارٹی خلکی کے راستے کاشغر پہنچ، اسی روز رچڈ گراہم کیتھ، روپرٹ، کیرولین اور میں ہاگ کا گک پہنچے۔ ہم ایک روپرٹ سے باری کی بہن اور بہنوی کے گھر گئے، جہاں پر لیں اور ہاگ کا گک میں ہمارے سرپستوں سے ملاقات کا اہتمام تھا۔ دوسری صبح کو ہمیں ایک روپرٹ پر پہنچنا اور بیجنگ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہماری یتیسی گاڑی جن راستوں سے گزر رہی تھی، وہ میرے دیکھے بھالے تھے۔ کیوں کہ میں نے تین برس یہاں بسر کیے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس کے باوجود کہ ہم کی رہنمائی کا بیشتر مارجھ پر ہے اور میں اس کا اہل بھی ہوں، لیکن لگتا تھا کہ جلد ہی یہ ذمہ داری چینیوں کو منتقل ہو جائے گی۔

بیجنگ میں ایک روزہ قیام کے دوران میں پرانے بیجنگ ہوٹل میں جو تن میں

سکولر کے قریب ہی واقع ہے ہمارے اعزاز میں پر تکلف ضیافت کی گئی۔ بڑے بڑے پرچم لہرائے گئے اور ہماری مہم کی جو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی، بڑی تعریف و توصیف کی گئی۔ ہماری مہم کی اہمیت کے اعتراض میں خصوصی ڈاکٹر جاری کیے گئے۔ ان پر ہمارے دستخط لیے گئے۔ ماڈ کے لائگ مارچ کے چھ کے قریب نام و ر جرنیلوں نے ہمارے ساتھ مصانعہ کیا۔ ہم ہوٹل سے فاتحین کا احساس لیے رخصت ہوئے۔ دوسری صبح برطانوی سفارت خانے میں دوران سفر موت کا لقمه بننے والوں کی میتوں کوٹکانے اور واپس بھجوانے کے مسئلے پر غور شروع ہوا تو ہم سب غم گین ہو گئے۔

مہم کے سبھی ارکان، سوائے جان اور اینی کے جو پاکستان میں اپنی گاڑی درست کراہ ہے تھے، کاشغر میں جمع ہو گئے۔ یہ ایک خوب صورت شہر ہے۔ قدیم اور جدید طرز تعمیر کا مرقع! یہاں کے گھروں کے گرد فصلیں تھیں۔ بازار خوب صورت اشیا سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں شاہراہ ریشم کے شہابی اور جنوبی حصوں کا باہم ملاپ ہوتا ہے۔ ہم نے کاشغر میں سابق برطانوی کونسل جزل کے گھر چینی باغ کی سیر کی۔ 1800 کے اوآخر اور 1900 کے اوائل تک یہاں جارج میکارٹنی اپنی سکائش بیوی کے ساتھ قیام پذیر رہا۔ وہ آدھا چینی اور آدھا انگریز تھا۔ اس نے اس دور افداہ علاقے میں 28 برس تک برطانوی نمائندے کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں اور علاقے کے بارے میں روس اور چین کی دلچسپی پر نظر رکھی تھی۔ میں نکلام مکان سے متعلق اپنی ابتدائی مہمات کے سلسلے میں اکثر یہاں آتا رہتا اور میکارٹنی ہی کے ہاں قیام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے میکارٹنی سے گھرے دوستائی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ چینی باغ اپنی شان و شکوه کو چکا تھا۔ اس کی عمارتیں یوسیدگی کا شکار تھیں۔ گرد و پیش میں بھاری ٹوکوں کی آمد و رفت سے چینی باغ ہمہ وقت لرزش کی زد میں رہتا۔ صحن چن کی حالت مختلف تھی، وسیع اور سربراہ خوشنا گلاب کے پھولوں سے لدے قطعات۔ میں جب وہاں پہنچا تو صاحب خانہ اور اس کی بیگم نے میرا پر جوش خیر مقدم کیا۔ ڈائینگ ہال میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ دراصل یہ وسط ایشیا میں ایک انگریز گھر انا تھا، جہاں پہلے کے بیش کو نسل جزوں کی بیگمات نے یا شاید موجودہ لیڈی میکارٹنی نے گلاب کے پودے اگائے تھے۔ 1934 میں اُس وقت کے کونسل جزل تھامس گلوور

کی بیگم اور ڈاکٹر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ہم نے عمارت کی چھت پر پہنچ کر یونین جیک لہرا دیا۔ 1949 میں کیونسٹ انقلاب کے بعد غالباً پہلا موقع تھا کہ کسی نے یہاں یونین جیک لہرا یا ہوا۔ اس یونین جیک میں نیپال میں میرے باپ کا تابوت پیٹا گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم شام کے وقت کاشغر کے لوگوں کو بال بچوں کے ساتھ گاتے بجاتے اور دھوئیں چھاتے دیکھتے رہے۔ ان کے گیت اور گانے بہت سریلے تھے۔ کافوں اور دلوں کو چھوتے تھے۔ دوسرے دن چینی ترکستان پر سورج کے طلوع ہوتے ہی گرد و غبار کی گھری تہہ سی لہرا گئی۔ ہم نے کاشغر کے جنوب کی طرف سفر شروع کیا۔ اس صورت میں کہ آگے گدھوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے پیچے ہماری سست رو گاڑی تھی۔ برطانوی افسر ہمیں دیکھتے تو یقیناً محفوظ ہوتے۔

چین کے کسی علاقے میں غیر ملکی گاڑیوں کو چینیوں کی نگرانی کے بغیر چلانے کا تصور بحال تھا۔ لیکن ہم اپنی گاڑیوں کو آزادانہ چلا رہے تھے۔ وہ بھی ایک نہایت ہی حساس چینی علاقے میں۔ ہم مٹی کے بنے گھروندوں اور چوبی عمارتوں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کھلی جگہوں پر کمٹی کے بھٹے سوکھنے کے لیے پڑے تھے۔ خوش رنگ لباس پہننے چینی پچے کھیل کوڈ میں مصروف تھے۔ کہاں وہ سادہ لوگ اور کہاں ہم کہ جنہیں جدید ترین سائنسی اور مشینی سہولتیں میسر تھیں۔ ہمارے درمیان نسل اور ثقافت کے لحاظ سے بعد امشر قین تھا۔ مقامی لوگ اپنی گدھا گاڑیوں میں بیٹھے ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب کبھی ہم ٹھہرتے تو باری بلند آواز میں نعرہ لگاتا ”السلام علیکم۔“ دو آدمی ایک ہی سائیکل پر سوار جا رہے تھے۔ انہوں نے جب ایک اجنبی کے منہ سے اسلام علیکم کا نعرہ سناؤ وہ ایسے جیران ہوئے کہ سائیکل سے نیچے آ گئے۔ پھر اٹھے، ہمیں حیرت سے دیکھتے ہوئے اپنی راہ پر چل دیئے۔

ہماری آنکھیں جنوبی شاہراہ ریشم پر گلی تھیں، جس کے ساتھ نخلستانوں اور ان میں گھری ہوئی بستیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ سین اور ہیڈن کا کہنا تھا کہ سائیکلوں پر س پہلے بھی ان بستیوں کا یہی حال تھا۔ البتہ ایک تبدیلی ضرور آئی تھی، سڑکوں پر بڑے بڑے ٹرک چلنے لگے تھے۔ ان کے ڈرائیور انہیں بے تکلفی سے اڑاتے اور پیچھے دھوئیں اور گرد و غبار کا طوفان اٹھاتے چلے جاتے۔

MashalBooks.com

MashalBooks.com

ہمیں کاشغر سے نکل تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ ہمارے جسموں پر گرد کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ ہم بے حد تھک گئے تھے اور سخت پیاسے تھے۔ ہم اپنی رہائش گاہ پر پہنچے، کمرے بے رنگ تھے، ان میں آہنی چارپائیاں بیچھی تھیں۔ فرش کنکریٹ کے بنے تھے۔ ان میں ایک سوراخ بھی تھا جو نائلک کا کام دیتا۔ قریب ہی پانی کی بڑی سی صراحی پڑی تھی۔ یہ ہمارے نہانے کے لیے تھی۔ میرے کمرے کے فرش پر دو بڑے بڑے مینڈک پھدک رہے تھے۔

مقامی سطح پر ہماری آؤ بھگت کا یہی انداز تھا۔ روایتی ضیافت اور اس میں تہذیقی تقریبیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم اپنی چینی ٹیم کے ارکان سے مل پائے۔ چینی ٹیم کا لیدر گیو جن والی تھا، اس کے بعد ڈاگ بوما کا درجہ تھا۔ اسے ہم میں شامل کرنے کا بظاہر ایک ہی سبب تھا کہ وہ مقامی زبان پر عبور رکھتا تھا۔ باہم اور جوشیلا بھی تھا۔ ایک 56 سالہ لاوزہاؤ سرکاری سائنس دان تھا۔ صحراء متعلق تحقیق کر چکا تھا۔ میری اس سے اپنی میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ وہ سخت جان، باویلہ اور اپنی ذات میں سمتا ہوا ہے۔

ان اوصاف کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کہ ہماری ہم میں اس کی شمولیت سودمند ہو گی۔ وہ بظاہر سکول ماسٹر لگتا تھا جو اپنے شاگردوں کو لے کر اتوار کی صبح کو سیر پر نکلا ہو، سفر شروع ہونے کے چار روز بعد رچڈ نے اسے خود پسند کہنا شروع کر دیا۔ اس کا رویہ کچھ اس طرح کا تھا جیسے وہ صحراء میں نہیں کسی باغ میں مژرگشت کر رہا ہے۔ کبھی کبھار وہ اس طرح بھڑک اٹھتا، جیسے پڑوں سے جلنے والا چولہا بھڑکنے لگتا ہے۔ کیوں لائی فوٹو گرافر کے طور پر ہماری ٹیم میں شامل ہوا، وہ لبے قد کا دبلا پتلا زرد زوٹ شخص تھا۔ اس کے اوپر کے دانت اٹھے ہوئے اور بال لبے تھے۔ میں نے پہلی نظر میں ہی بھاپ لیا کہ وہ بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ چنان ممکن نہیں ہو گا۔ میں نے اس کی شمولیت کے خلاف سخت احتجاج کیا لیکن چینی ارکان مانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کا نمائندہ ہے۔ اسے بیجنگ سے، ہم پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ کیتھے نے جلد ہی تقدیق کر دی کہ کیوں لائی کا فوٹو گرافی سے کوئی علاقہ نہیں۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا کہ اسے جعلی فوٹو گرافر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ میں اپنی ٹیم میں صرف دو چینیوں کو شامل کرنے پر تیار تھا۔ لیکن ہم پر ایک جعلی فوٹو گرافر اور ایک نام نہاد سائنس دان بھی مسلط کر دیا گیا۔

اگلی صبح دو کوہانوں والے تیس خوبصورت اونٹ اور ان کے ساتھ چھ سار بان، اپنے

اپنے خاندان لیے آ گئے۔ صحن اونٹوں کی لید اور فضا اس سے اٹھنے والی بو سے بھر گئی۔ سبھی اونٹ خوب موٹے تازے تھے۔ وہ مہینوں سے چارہ کھانے کے سوا کوئی کام نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ آیا وہ صحراء کی ریت پر کتنی دور تک چل سکیں گے یا ان میں بھوک پیاس برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ ہماری گاڑیوں اور ان پر لدے ہوئے سامان کے ساتھ اونٹوں کا کوئی میل نہیں تھا۔ وہ سفر کی کسی دوسری تاریخ سے تعلق رکھتے تھے۔ اونٹوں سے متعلق تجربہ رکھنے والے کسی شخص کے لیے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ صحراء کے ہماری بقا کا ان پر کتنا انجام ہے۔

رجڑ نے زہاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اب اندازہ ہوا ہے کہ وسطی ایشیا میں کسی کے پاس آپ سے زیادہ اونٹ نہیں۔ ہیڈن نے 1895 کی مہم کے لیے جو تیاریاں کی تھیں، میں بھولائیں تھا۔ اس نے مارکیٹ سے مزار تاغ کی طرف صحراء بور کرنا چاہا تھا۔ اس کوشش میں صرف وہ، دوسرا بان اور ایک اونٹ زندہ بچا۔ دوسرا بان اور سات اونٹ ریت میں دفن ہو گئے۔ مارکیٹ پہنچ کر اس نے سفر کی خاطر ضروری سامان جمع کرنا شروع کیا۔ اس میں چار آہنی واٹر نینک اور چھ میکین شامل تھیں۔ اونٹوں کی غذا کے طور پر سیسم کا تیل بھی لے لیا گیا۔ ہر اونٹ کا نام بھی تجویز کر لیا گیا۔ جگتاںی، ٹرکی وغیرہ۔ مقامی زبان میں ایک سفید، دوسرا ایک کوہاں والا، ایک بوڑھا، ایک بہت سیاہ اور ایک کم سیاہ کہلا یا۔

22 دسمبر کو بہت پچھتیاری اور سامان میں کاثٹ چھانٹ کرنا تھی۔ ہمیں مارکیٹ سے چھ میل مشرق میں پہلا کیپ قائم کرنا تھا۔ اور 24 تاریخ کو ہم کا آغاز کرنا تھا۔ یعنی صحراء کو عبور کرنے کی مہم پر اترتا تھا۔ روپرٹ، مارک اور میں نے پیلا گاڑی لی اور ٹینوں کے کنارے پہنچ کر ریڈیو، سیٹلائٹ اور رہنمائی کے سامان کی جانچ شروع کی، میں گاڑی سے نکل کر کوئی آدھا میل ریت میں چلا تھا کہ گرمی کی شدت کے باعث چکرا کر رہ گیا۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اسی عالم میں واپس گاڑی تک پہنچا، میرے گھٹنے میں شدید درد ہونے لگا۔ میں نے ہمت سے کام لینے کا سوچا لیکن اس حقیقت سے آنکھیں نہ چراسکا کہ گزرنے والا ہر دن ہمیں مددگاریم سے دور لے جائے گا۔ روپرٹ نے لاکھ جتن کیے، وہ سیٹلائٹ کے ذریعے رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔ سیٹلائٹ کا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اب ہمارے لیے بیجنگ میں اپنے سفارت خانے اور انگلستان سے پیغام رسانی ممکن نہیں رہی

تھی۔ ادھر مارک، فرانس سے تعلق قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ مارک مارکیٹ میں ہائی فریکوئینسی (High Frequency) ریڈیو سے کام لینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ صرف چھوٹے ریڈیو جو ہمارے پاس تھے، اونٹوں کے کارروان کے درمیان دو تین میل تک میں رابطے کا کام کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا ہوتا ہے ہونا برا بر تھا۔ ریوپرٹ اور میرے درمیان بھی سیستھلاشت کے ذریعے رابطہ تو رہا ایک طرف دونوں کے آلات پر ایک دوسرے سے مختلف ریڈنگ آ رہی تھی۔ میں جھنجھلا گیا اور پاس سے گزرنے والی ٹیم کے ارکان اور ان کے آلات دیکھنے لگا۔ اس پر چینیوں سے میری پہلی تھنگ کلامی ہو گئی۔ میں نے کیولاٹی کے آلات کی طرف ہاتھ بڑھایا تو گیو نے مجھے منع کیا اور کہا کہ چینی اپنے سامان کو ہاتھ لگانے اور دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں دیتے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ان میں سے کوئی بھی اپنی تسلی کے لیے ہماری ٹیم کے سامان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ کیوں کہ ہم صرف وہی سامان لے جا رہے ہیں جس کی اشد ضرورت ہے۔ گیو نہیں مانا، اس کا کہنا تھا کہ چینیوں کے ہاں یہ رواج نہیں۔ کیولاٹی بھی پاس کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ تھا۔ اس کے چہرے پر خنگی اور خشم گینی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کو خاموش اور مطمئن دیکھ کر میں نے بھی اپنے غصے پر قابو پا لیا اور دشیے لبھے میں کہا کہ ہم میں سے کوئی بھی ضرورت سے بڑھ کر کوئی اونٹ نہیں لے جائے گا۔ کیوں کہ اس سے فائدہ کم اور تکلیف زیادہ ہو گی۔ مہم کی قیادت میں کر رہا ہوں، یہ دیکھنا میرا کام ہے کہ ضرورت کی ہرشے موجود ہے اور سارا انتظام بے عیب ہے۔ رچڑ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مہم میں تصادم کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، تجویز کیا کہ ”چارلس آپ گیو کو اپنا سامان دکھا دیں۔“ میں نے حامی بھر لی تو رچڑ نے گیو سے پوچھا کہ ”آپ اپنا سامان چارلس کو دکھائیں گے؟“ اس نے کہا کہ ”ہاں دکھا دوں گا۔“ ”پھر وہ گیو کا سامان کیوں نہیں دیکھ سکتے۔“ ”اس لیے کہ یہ چینی طریقہ نہیں۔“ سامان دیکھنے پر کمی بار کے اصرار کے باوجود کوئی نتیجہ نہ لکھا تو میں نے مزید کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے ان کا سامان کھول کر دیکھے بھی لیا تو سفر شروع ہونے سے پہلے ہی اس میں وہ تمام اشیا شامل ہو چکی ہوں گی جن کے لے جانے پر ہمیں اعتراض تھا۔ ایک بار پھر کوشش کر لینے میں مضاائقہ نہیں۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ صحرائیں داخل ہونے پر چینی ہٹ وھری چھوڑ دیں اور ہمیں وہ ساری اشیا دکھا دیں جو وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ کھلا کہ کیولاٹی سرکاری

کارندہ تھا، اس کے سامان میں جو آلات تھے وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر دوسرے کے سامان سے دو گنا وزنی تھے۔ پیشہ و فن و گرافر کی تھے کے سامان سے بھی۔

چینی ہماری مہم کے شروع ہونے کا بڑا چرچا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ پہنچی اور دوسری ساری رسمیں ادا کرنے پر زور دے رہے تھے۔ انہیں اس مہم کی بنیادی اہمیت کا ادراک ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم تفریق کے طور پر صحرائیں جاری ہے ہیں۔ خوش خوش جائیں گے اور خوشی خوشی واپس آ جائیں گے۔ اس لیے غیر معمولی اور کڑے انتظامات کی قطعا ضرورت نہیں۔ ان کے اسی رویے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو تشویش میں بٹلا کیے رکھا۔ جس پارٹی کو ہر اول کے طور پر آگے جانا تھا، وہ میدان میں کھڑی تھی۔ اس کے سبھی ارکان کا گری کے مارے برا حال تھا۔ ان کے قریب پانی کی ٹینکیوں، کھانے پینے کی اشیا کی گھریوں اور اوتھوں کی کاٹھیوں اور کچاووں کا خاصا بڑا انبار لگا ہوا تھا۔ بے ترتیبی اور بے ہنگم پن کی کیفیت تھی۔ درمیان میں مقامی لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان سب نے ماڈ کیپ پہن رکھی تھی۔ اتنے میں چینی ٹیلی ویژن کا عملہ بھی آ پہنچا۔ اس کے ساتھ پارٹی کے ارکان تھے جنہوں نے ہکلا مکان کو سخت کرنے کی مہم کے پہلے دن سے متعلق بڑے بڑے پوسٹر اٹھائے ہوئے تھے۔ ہماری ایک گاڑی ابھی تک اسلام آباد کے قریب پڑی تھی اور پیغام رسانی کے آلات اچھی طرح کام نہیں کر رہے تھے۔ میں نے گھوس کیا کہ مہم پر میری گرفت آہستہ آہستہ ختم ہوتی چاہی ہے۔

رجڑ نے اس روز کے کوائف اپنی ڈائری میں لکھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سامان کے بارے میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ معاملہ سامان کے معائنے کا اور چینیوں کی تعداد کم کرنے کا تھا۔ ہم اسے برطانوی مہم سمجھتے تھے۔ لیکن چینی نقطہ نظر جدا گانہ تھا۔ وہ اسے ایک مشترکہ مہم کہتے، جس پر اصل کنٹرول چینیوں کا تھا۔ وہ اسے ہین الاقوامی رنگ دینا چاہتے تھے اور ٹو رازم کے عروج کا وسیلہ گردانے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک صحافی بھی تھا جو نہ کچھ لکھتا تھا اور نہ ہی کوئی فوٹو لیتا تھا۔ اسے بیبگ نے ہم پر مسلط کر دیا تھا۔

شام تک ہم کچھ لفڑم و ضبط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ روپرٹ نے سیکلائٹ کے موافقانی نظام کے کارپو داز سے رابطہ قائم کر لیا۔ وہ میرینی میکنالوجی انٹریشنل تھا جس کا دفتر جنوبی انگلستان میں ہینگلٹن کے مقام پر تھا۔ اس نے ہماری مشکل آسان

کرنے کے بارے میں ہدایات دیں اور رہنمائی کی۔ ہم پیر و فی دنیا سے رابط قائم کرنے کے قابل ہو گئے۔ ہم اپنے سر پرستوں اور گھر والوں کو معلومات فراہم کرنے لگے۔ دریں اشنا مارک اور فرانس نے ریڈیو سے رابط قائم کرنے کا مسئلہ حل کر لیا۔

مارکیٹ کے میر نے ہماری صحرا میں روائی کے اعزاز میں اگلے روز تعطیل کا اعلان کر دیا۔ ہمارا باقاعدہ جلوس نکلا گیا۔ ہمارے آگے آگے تاشے بج رہے تھے اور پتاخے اور چھل جھڑیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ اس شوروں کا ایک اثر یہ ہوا کہ اونٹ بدک گئے۔ انہوں نے چارہ پہلے ہی کھالیا تھا، ورنہ بھوکے رہ جاتے۔ اتنے میں سکولوں کے طلباء بینڈ بجاتے آپنچے۔ وہ ہمارے آگے آگے چل رہے تھے اور ہم ان کے پیچے پیچے۔ طلباء برطانوی اور چینی پرچم لہرا رہے تھے۔ چینی فوجی افسروں کی یونیفارم اور مقامی افسروں کی لباس پہنے موجود تھے۔ ہماری گاڑیاں، اونٹ اور سارے بان سب سے پیچے تھے۔ ہم جس راستے پہنچاں ہاں میں پہنچے، اس کے دونوں طرف لوگ چار چار قطاروں میں کھڑے تھے۔ ہاں پر ایک بڑا پرچم لہرا رہا تھا جس پر لکھا تھا کہ چین اور انگلستان کی مشترکہ مہم بلکلامکان صحرائے عبور کرنے کے لیے جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ خواب کا ساتھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ہمیں اتنی دھوم دھام سے رخصت کیا جائے گا۔ حق تو یہ ہے کہ ہم یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر ہم کی مشکلات اور درپیشیں خطرات سب کچھ وقتی طور پر بھول بیٹھے۔

ہاں کے سامنے لمبی میزیں بھی تھیں اور ان پر زیبائی بیان رکھی جملہ رہی تھیں۔ سکولوں کے طلباء بگی وردیاں پہنے ریت کے سمندر میں کشتیاں چلا رہے تھے۔ مقامی رقص روانی کا لے اور سفید ملبوسات پہنے، چینی افراد کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بینڈ جنگی دہنسی بجا رہے تھا۔ ڈھولوں اور تاشوں کی آواز سنتے سنتے ہم تھک گئے۔ میں نے اس شورو غوغائی میں اپنی آواز بلند کرتے ہوئے رچڑ سے کہا کہ اگر یہ سب کچھ ہمیں الوداع کرنے کی غرض سے کیا جا رہا ہے تو جب ہم صحرائے عبور کے واپس آئیں گے تو پھر کیا کیا جائے گا؟ ”چین کے ہیرہ،“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ چینی، مقامی زبان اور انگریزی میں پُر جوش تقریروں کے بعد المغیور عورتیں شرماتی جاتی ایں، انہوں نے اپنے پاؤں پھیلار کھے تھے۔ وہ ہمارے پاس آئیں اور ہمیں روانی چونے پیش کیے۔ مردوں نے ہمیں وہ ٹوپیاں پہنائیں جو نماز پڑھتے وقت پہنچی جاتی ہیں۔ وہ جھکے اور اپنی جگہ پر جا پنچے۔ ہم نے محسوس کیا کہ

ہم دنبے ہیں جنہیں قربان کیا جانا مقصود ہے۔ ان کے بعد ایک ٹولی آئی، اس نے ہمارے سامنے پھرے کے لئے کھولے، ان میں لکڑی کے بنے ہوئے آلات موسیقی تھے۔ یہ مارکیٹ کے لوگوں کی طرف سے برطانیہ کے لیے تھے تھے۔ ان آلات پر ”راہل جو گرفیکل سوسائٹی“ کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے ہماری ہم کا نعرہ، یونین جیک اور اونٹ تھے۔ جس کے قدموں میں ”کیمیل کراسنگ فار چلدرز کینسر“ درج تھا۔ یہ نعرہ میری تحقیق تھا۔ میں نے ایک دفعہ طیارے میں جرمی جاتے ہوئے لکھا تھا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ ایک دن یہ نعرہ تحقیقت کا روپ دھار لے گا۔ ہم چین کے علاقائی لباس پہنے کھڑے ہوں گے اور ہمیں مقامی تھاں پیش کے جا رہے ہوں گے اور ہمیں سات سمندر پار کی سفید قام ملکہ کے سفیر سمجھ کر، طرح طرح کے نوازدہ سے نوازا جا رہا ہو گا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ صمرا میں ہمارے جانے کو اس انداز سے منایا جائے گا۔ مجھے افسوس تھا کہ انگستان میں کسی کو یہ سب کچھ دیکھنے کا کبھی موقع ہی میرا نہیں آئے گا۔ یا چین کے ایک دورافتادہ علاقے میں یہ سب کچھ پھر سے ڈھرایا جاسکے گا۔

اس ہم کے آخر میں چار اماموں نے ہمارے لیے دعا کی کہ خدا موت کے صمرا میں ہمارا محافظ ہو اور اپنے تحفظ اور امان میں رکے۔ اب ہمارا اصل سفر شروع ہوا، ہم مشرق کی طرف چل رہے تھے اور سڑک کے دونوں طرف سکولوں کے طبا قطاریں پاندھے کھڑے، کاغذی جھنڈیاں لہرائے تھے۔ ان کے پیچے اور لوگ تھے۔ ہم پر جوش بھوم کے پاس سے گزرتے ہوئے الوداع، الوداع کہتے، کئی لوگ رو رہے تھے۔ عورتیں کیرولین کے پاس آتیں تو ان کے رخساروں پر آنسو بہرہ رہے ہوتے اور وہ کہتیں کہ موت کے صمرا کا سفر نہ کرو۔ میں نے ان کے سادہ، مخصوص چہروں پر خوف کی پرچھائیں دیکھیں، مجھے پہلی بار لگا کہ وہ ایسا کچھ جانتے ہیں، جو ہم نہیں جانتے، ان کے جذبات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری ہم کے پر خطر ہونے کا علم رکھتے تھے۔ یوں لوگ رہا تھا کہ ہم اپنے سفر آخرت پر نکل رہے ہیں اور ہمارا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ پھلے ہوئے ہاتھوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے لگا کہ میں بھی رودوں گا۔ اچانک مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ میں واپس نہیں آ سکوں گا اور جو اجنبی ہمیں الوداع کہ رہے ہیں، وہ آخری لوگ ہوں گے، جنہیں ہم نے دیکھا ہو گا۔ میرے اندر یہ خیال ابھرا کہ میرے اپنے لوگ، میرے پیارے، یہاں ہوتے، یہ منظر دیکھتے

اور میں انہیں اپنی چھاتی سے لپٹاتا۔

میں نے روپورٹ، کیتھ، کیرولین اور رچڈ کو دیکھا۔ ان کی اپنی کیفیت ویسی ہی تھی جیسی میری۔ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیا ہم جانی نقصان کے بغیر حمرا سے نکل سکیں گے اور کیا ہم سبھی آخر تک وہیں رہیں گے؟ جو کچھ بھی ہوا، اس کا تمام تبار بجھ پر ہو گا۔ میں ہی گنہ گار سمجھا جاؤں گا، صرف میں۔ سیوں ہیڈن کے سفر کی روادا ہم پر عیال تھی، اسے بھی 98 برس پہلے مارکیٹ سے اسی انداز میں الوداع کہا گیا تھا۔

10 اپریل کی صبح کو ہمارے آٹھ تنومند اونٹ اور ان کے سارے بان مارکیٹ سے باہر نکلے تھے۔ اونٹوں پر بھاری سامان لدا تھا اور ان کے گلے میں کافی کی گھٹیاں اس طرح نک رہی تھیں کہ جیسے جنازے میں بجا کرتی ہیں۔ دیہات کے رہنے والے چھتوں اور گلیوں میں جمع تھے۔ سب افرادہ تھے، ہم نے انہیں درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں ایک دوسرے کو کہتے سن کہ ”یہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اونٹوں پر بہت بوجھ لاد دیا گیا ہے، وہ گھری ریت میں سے نہیں نکل پائیں گے۔“ بینڈ کی آواز، گیتوں کے بول اور سازیوں کے سرنگیت آہستہ آہستہ مضم ہوتے گئے۔ ہم ایک چھوٹے پل پر پہنچنے تو وہاں پر آتے آتے سڑک بھی ختم ہو گئی۔ میں بہت تھک گیا اور میرے جسم سے پینہ پھوٹ کر بہنے لگا۔ رچڈ نے اپنی ڈاری میں لکھا ”بکریاں، بھیڑوں سے علیحدہ ہو گئیں، سرکاری کارندے، موڑ گاڑیاں، اونٹ اور ہم سب ایک جگہ اکٹھے تھے۔ شور مچا چا کر ہمارے گلے بیٹھنے کے تھے اور شدید گری میں، دن بھر چلتے رہنے کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک ٹوٹی کاشغر سے ہوتی ہوئی ارجمند پہنچتی ہی، وہ راستے کی کلفتوں کا حال پتا تے تو ان کی آواز زندہ چلتی۔ تاہم یہ خیال ان کے لیے کسی حد تک راحت اور اطمینان کا موجب تھا کہ ہم ایک پُرخُن آزمائش میں سے گزر آئے ہیں۔ جن جیپوں پر وہ سفر کر رہے تھے، ان کی کھڑکیاں پوری طرح بند ہو گئی تھیں۔ ہم اچھلتے، کوہتے، ریت کے ٹیلے عبور کرتے آرہے تھے۔ جب ریت کا طوفان اٹھتا تو ہم رک جاتے اور اس کے گزر جانے کا انتظار کرتے۔ لارنس آف عربیا اور یاس عرفان، ان حالات سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ ہم رہنٹے ٹیلوں میں رکے، ہم خوف ناک خاموشی کے حصاء میں تھے۔ ایسی خاموشی جو جنگ کے شروع ہونے پر چھا جایا کرتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک بہادری کا کوئی کارنامہ دیکھنے جا رہا تھا۔ صرف دُشمن کا قیصیں نہیں ہو پایا تھا۔ ہم غیر ملکی ایک

مقدمہ کے تحت، دوربینیں نقشے اور ضروری معلومات لیے قدم بڑھاتے جا رہے تھے۔ مارکیٹ سے پُر جوش اور خوش رنگ الوداع اور گزشتہ چند ہمینوں کے دوران میں طاری ہونے والی جذباتی کیفیت، بدنام صحرا میں اترتے وقت خوف میں ڈھل گئی۔ اس وقت تک ہمارے منصوبے کو تائید و حمایت حاصل ہو چکی تھی اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہماری ہمہ کامیاب ہو گی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے دور فاصلے پر مارکیٹ کے پاس درختوں کی قطار، لہلہتے کھیت دکھائی دیے۔ مشرق کی جانب ریت کا ایک سمندر تھا۔ جو دور دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس کی ریت لمبیں کی صورت میں حرکت کرتی اور کبھی بکھار بلند ٹیلوں کی شکل اختیار کر لیتی۔ لگتا کہ وہ آنے والوں کی راہ روک رہی ہے۔ ریت سے منکس ہونے والی روشنی سے آنکھیں چند ہیجا جاتیں۔ ہوا گرم اور خشک تھی اور جس مہم پر ہم نکلے تھے وہ بے پناہ ہمت اور قوت برداشت کی طالب تھی۔

صحرا کے کنارے ہم نے جو بیس کمپ قائم کیا تھا، وہاں پانی پہنچا تو ہم نے اس سے 80 لٹر کے ڈبے بھر لیے۔ ان میں سے چھ ڈبوں میں چھید تھے۔ جس سے پانی رس رس کر کل رہا تھا۔ انہیں اچھی طرح دیکھنے کی میری ذمہ داری تھی۔ لیکن چینیوں نے ہمیں الوداع کہنے کے سلسلے میں جو غلغلا پا کیا تھا، اس میں ان ڈبوں کی جانش پڑتاں نہ کی جاسکی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان ڈبوں کو واپس مارکیٹ بھیج دیا جاتا اور کسی مقامی ویلڈر سے ان کی مرمت کرائی جاتی۔ یہ واپس آتے تو گلی صحیح ہم سفر پر روانہ ہوتے۔

شام ہوئی تو صحرا ٹھنڈا ہو گیا۔ انہوں کے سارے باؤں نے ہمیں آخوندی دعوت میں شرکت کا موقع فراہم کیا۔ ہم، چینی سرکاری کارنڈے، سارے باؤں اور ان کے خاندانوں کے لوگ دائرہ ہنا کر بیٹھ گئے۔ وسط میں تربوز، بھیڑوں کی رانوں، سری پاپیوں، روٹیوں اور چاولوں سے بھری ہوئی طشتیاں رکھی تھیں۔ سارے باؤں، جنہوں نے دعوت کا اہتمام کیا تھا، سادگی اور شرافت کے نمونے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہروں پر خاص قسم کی دک تھی، جیسے انہوں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔

ہمارے چھ کے چھ سارے باؤں مارکیٹ کے قریب کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ دوران سفر میں ہمیں پرانے کے باہمی روابط اور تعلقات کی گہرائی کا علم ہوسکا۔ ان کے تشخض اور پس منظر کو جانے کے لیے اتنا ہی قرب لازم تھا، جو ہمیں ان سے حاصل ہو گیا تھا۔ عیسیٰ پوتا

سارپا نوں کا سر برہا تھا، تمام سارباں اس کا بے حد احترام کرتے۔ اس کے بعد عبدالرشید تھا جس کی آنکھیں اکثر بھلی رہتیں اور ہونٹوں پر لکھی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ کریم یونس نوجوان ذہین اور کسرتی جسم والا تھا۔ وہ سارباں سے کہیں بڑھ کر گلتا تھا۔ اس کا روزہ تھا۔ وہ عیسیٰ پولتا کا بھیجا تھا۔ وہ خوش باش نوجوان تھا۔ اس کی گفتگو میں مزاح کی چاشی تھی۔ وہ بتاتا تھا کہ اس کی عمر 31 سال ہے اور اس کی دو پیٹیاں ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے تین بیٹے ہیں۔ اس نے کہا بہت اچھے، بہت اچھے۔ عیسیٰ کے پاس لوگوں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایک نیپالی یاد آتا، جس کے خدو خال مغلوں سے ملتے تھے۔ وہ سب سے کم عمر تھا، اس کے چار بچے تھے۔ وہ عیسیٰ پولتا کا داما دھا۔ بات بات پر مسکراتا اور نرم لبھے میں بات کرنا اس کی خصوصیت تھی۔

صحح ہو گئی تھی اور زانگ بوا بھی تک واپس نہیں پہنچا تھا۔ دس بجے کے قریب آیا تو گلتا تھا کہ وہ شہر میں سونہیں سکا، وہ پانی کے ڈبے مرمت نہیں کر سکا تھا۔ ان کی جگہ وہ 20 لڑکے پلاسٹک کے ڈبے اٹھا لایا تھا۔ وہ بہت کمزور تھے، انہیں دیکھ کر میں تو کھول گیا لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا، ناچار ان میں پانی بھرا۔ ان کے ڈھنکنے ناقص تھے۔ ڈبہ ذرا سا ہلتا تو پانی چھک جاتا۔ ہم نے کپڑا کاٹ کر ڈھنکوں میں رکھا۔ اس سے پانی بہنارک گیا۔ دوسرا مشکل یہ تھی کہ پلاسٹک کے صرف دو ڈبے، ایک اونٹ کے بوریے میں رکھے جاسکتے تھے۔ وزن کو بانٹنے میں مشکل پیش آنے لگی۔

مزارتانگ تک پہنچنے میں سائز ہے تین ہفتے لگے تھے، اس کے لیے 1800 لڑپانی چاہیے تھا۔ ایک آدمی کے لیے 5 لڑپانی یومیہ، دو لڑپانی پینے کے لیے، ایک لڑپانی ہر آدمی کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے، دو لڑپانی کھانا اور چائے تیار کرنے کے لیے۔ پانی ضائع کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ درجہ حرارت سو سے بڑھ جانے کی صورت میں بھی اتنا پانی کافی تھا۔ مجھے اصل فکر اونٹوں کی تھی، ان کی پیاس بھانے کا انحراف قدرت پر تھا۔ صحرا میں ان کے لیے پانی تلاش کرنا اور کھود کالانا مشکل تھا۔ شین اور ہیڈن نے اپنے سفر ناموں میں کچھ حوالے دیے ہیں لیکن پانی کہاں سے دست یاب ہو سکتا ہے، ان سے کچھ مدد نہیں ملتی۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ مزارتانگ تک کے سفر میں شاید کسی جگہ پانی مل جائے لیکن یقین اور قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میرے پاس سیپلاسٹ کے جو چارٹ اور نقشے تھے

ان سے پانی کے سلسلے میں کچھ رہنمائی نہیں ہوتی تھی۔ ایک اونٹ کے لیے ہر تیسرا دن 40 لتر پانی چاہیے تھے۔ اتنی مقدار میں پانی لے کر چلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ میرا سارا منصوبہ ایک بہت بڑا جو تھا۔ قسمت ساتھ دے تو کئی مقامات پر زمین کھود کر پانی حاصل کیا جاسکے گا۔ قدرت کا یہ ایک راز تھا۔ اب یا تو پانی مل سکتا ہے یا نہیں مل سکتا۔ کیا ہم پانی تلاش کرنے میں کامیاب ہوں گے؟ ہیزن نے بعض مقامات پر گھرے کنوئیں کھود کر پانی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن کیا ہم بھی کرسکیں گے؟ اس کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ اور تدریجیاً ریت مرطوب ہونے لگی۔ ظاہر تھا کہ یونچے پانی تھا۔ ہم نے چھ فٹ تک کنوائی کھودا تو ریت اتنی مرطوب تھی کہ اسے مٹھی میں بھیجن کر گولہ بنا سکتے تھے۔ اونٹوں نے اپنی لمبی گرد نیں، کنوئیں کے گرد جھکا کر مرطوب ریت سوچکی، ہم سب کنوئیں کے گرد ہالہ پاندھ کر کھڑے دیکھ رہے تھے کہ قاسم نے کھدائی کرتے کرتے ہاتھ روک لیا اور پھاڑڑہ چھینک دیا۔ کیا ہوا؟ ہم نے پوچھا، ”ریت خشک ہے“ یہ آواز جیسے قبر سے آئی ہو۔ ہم ہار گئے۔ ہم تھک گئے تھے۔ ہم نے تین گھنٹے تک جو محنت کی تھی، اکارت چلی گئی۔ اونٹوں کو تین دن سے ایک قطرہ پانی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اونٹوں کو وہیں کھڑا چھوڑا اور خود آرام کرنے چلے گئے۔ یہ طے تھا کہ ہماری زندگی کا انحصار، اونٹوں کے لیے ریت میں پوشیدہ پانی کی دست یابی پر تھا۔



صحرا میں آمد

24 ستمبر کی دوپہر کو جب گرمی عروج پر تھی، میں نے صحرا میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں چین میں آئے پانچ روز ہو گئے تھے لیکن یہاں کے موگی حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکے تھے۔ سٹی سمندر سے 5000 فٹ بلندی پر ہونے کے سبب سے جسمانی قوت میں کمی آ سکتی تھی۔ اب تک ہم نے جو تیاری کی تھی وہ ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ناموافق اور ناگوار صحرا میں انسانوں اور اونٹوں کو کسی مناسب تیاری کے بغیر لے جانا غیر ذمہ دارانہ فعل تھا۔ لیکن ہمارے لیے اونٹوں سے مناسب اور تعلق خاطر پیدا کرنے اور ان پر سامان لادنے اور اتارنے کے طریقوں سے واقف ہونے کا وقت نہیں تھا۔ پانی کے ڈبے قابلِ اعتماد نہیں تھے۔ ان سے کسی وقت بھی پانی رسانا شروع ہو سکتا تھا۔ آلات اور کھانے کی اشیا کی اچھی طرح جانچ نہیں کی گئی تھی۔ کوئی بھی دیکھنے والا کہہ سکتا تھا کہ ہم نے تمیں اونٹوں، تین مختلف شفافتوں، پانی کے چند ڈبوں، اونٹوں کے چارے کے گٹھوں، ارڈگرڈ کی اشیا اور سب سے بڑھ کر جدید ترین ٹیکنیکل آلات کو صحرا میں لا پھینکا تھا۔ اور اس کا نام 'مہم' رکھ دیا تھا۔ اگر کسی بھی معاملے میں کوئی غلطی پیش آ جاتی تو اس کا الزام میرے سر آتا اور مجھے قائدانہ صلاحیت سے عاری کہا جانے لگتا۔

دوسری طرف میں اپنے تجربے کی بنی پر کہہ سکتا تھا کہ 'مہم' کا شروع کیا جانا بجائے خود بہت اہم تھا، وقت کے ساتھ سب معاملات اپنے طور پر صحیح ثابت ہونے لگتے۔ کچھ ایسے واقعات پیش آ سکتے تھے جو تربیت سے کہیں زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوتے۔ مجھے یقین تھا

کہ شروع کے پانچ دن آہستہ آہستہ گزار لیے گئے تو تمام اشیا کام کرنے لگیں گی۔ بس اونٹوں کے لیے پانی کے بارے میں تجھ تھا۔ یہ قدرت کے ہاتھ میں تھا۔

1895 میں ہیڈن کی مہم جس طرح ناکامی سے دوچار ہوئی تھی، اس کی طرف بار بار دھیان جاتا۔ سفر شروع ہونے سے پہلے ہی ایک اونٹ بے قابو ہو گیا، اس پر لدے ہوئے پانی کے دو پیپے زمین پر گر پڑے، ایک اپنے منہ کے بل گرا، جس سے اس کا اوپر کا حصہ ٹوٹ گیا۔ اونٹ کے بھاگ نکلنے سے دوسرے اونٹوں میں جو بے چیزی اور افترفروی پیدا ہوئی، ہم انہیں سنبھالنے کے لیے دوڑ پڑے۔ اس اثنا میں گرے ہوئے پیپے سے باقی ماندہ پانی بہہ کر زمین میں جذب ہو گیا۔ دوسرا مذکا اتنا خراب نہیں ہوا، البتہ اس کا پانی ہم نے پلاسٹک کے جیری کین میں بھر لیا۔

کیرولین نے مذاق سے کہا کہ اب تک جو کچھ پیش آ رہا ہے، وہ ہیڈن کے ناکام تجربے کا اعادہ ہی دکھائی دیتا ہے، پہلے ہم نے مارکیٹ کی عورتوں کو روتے اور واویلا کرتے اور پھر پانی کے مکملوں کو تباہ ہوتے دیکھا۔ آگے کیا ہو گا؟ رچڈ بولا آگے کیا ہو گا؟ یہ کہ چارلس زندہ رہنے کے لیے اونٹوں کا پیشاب اور لہو پی رہا ہو گا۔

اونٹوں کو قابو میں کر لینے اور ان پر سامان کو اچھی طرح ترتیب دے اور باندھ لینے کے بعد ہم آگے بڑھے۔ میں نے ٹینا کے نام جو خط لکھے تھے، وہ امدادی ٹیم کے حوالے کیے، وہ اس عجلت اور بے دھیانی میں لکھے گئے تھے کہ یہ سوچ کر ہی احساس جنم ہوتا۔ میں نے تیسری بار نقشہ کھول کر دیکھا اور یوپرٹ سے، جس کے پاس قطب نما تھا، سمت کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے اپنے کندھے سے سامان اٹا رہا۔ اس میں سے قطب نما نکالا اور ہم سے کچھ دور جا کر سمت کے بارے میں تصدیق کی۔ اونٹوں کی رفتار سے ہماری رفتار کا تعین کیا گیا۔ اب اونٹ کی فی گھنٹا کی رفتار کو سارے کارروان کی معیاری رفتار تسلیم کر لیا گیا۔

صحرا میں اترتے وقت میرے جذبات ملے جلے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میں جس مہم کی قیادت کر رہا ہوں، وہ کامیابی سے ہم کنار ہو گی۔ باری، فرانس اور مارک تھوڑی دور تک ہمارے ساتھ چلے۔ باری نے مذاق میں کہا کہ خدا کرے تم اس مہم سے زندہ سلامت واپس آ سکو۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میں ٹینا کو یہ اطلاع دینے کے لیے زندہ رہوں کہ

چارس کو صحرائے کھا گیا ہے۔ میں نے بارفی سے کہا کہ تمہیں میرے بیٹے ٹوبائی کی تعلیم و تربیت کا بار اٹھانا ہو گا۔ اس لیے کیا تمہارے حق میں یہ اچھا نہیں کہ تم میرے صحراء سے زندہ نکل آنے کی دعا کرو! بارفی ہوں ہاں ہی کہہ سکا۔ وہ نبجیدہ ہو گیا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ ہم مہم کی کامیابی پر کئی بار پہلے بھی گفتگو کر چکے تھے۔ بارفی نے لندن میں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم اس مہم میں کامیاب ہوں گے۔ میں نے ہمیشہ ہاں میں جواب دیا۔

ایک دوست کے شبہات سن کر میری خود اعتمادی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بارفی ایک ٹیم کی سربراہی کر رہا تھا جو ہنگامی حالت میں ہمیں بچانے پر مأمور تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ بارفی کے خیال میں ہم سب مارے جائیں گے یا صحرائیں کہیں غائب ہو جائیں گے اور یوں صحراء سے متعلق جو روایت چلی آتی ہے اسے دوام بخشنے کا وسیلہ ثابت ہوں گے۔ میں نے اس کی باتوں سے بس یہی اخذ کیا کہ ہم درپیش مشکلات کے سب سے صحرائیونہیں کر سکیں گے۔ اس نے وضاحت نہیں کی اور میں نے مزید پوچھا نہیں۔

میں پسینے سے نہا گیا تھا۔ ہم ناہموار ریتلے ٹیلوں پر بمشکل آدھا میل چلے ہوں گے۔ ریت بہت باریک اور نرم تھی اور کیرولین نے جو گولیاں دی تھیں، ان کے کھانے کے باوجود میرے گھٹنے کے درد میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ زخم پرستور موجود تھا۔ میں دل میں اس کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ آیا میں صحرائے کو عبور کرنے کے قابل بھی ہوں؟ میری قیادت میں یہ مرحلہ طے ہوتا ہے یا نہیں، اب مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ میں نے اپنی توجہ ہم کے شروع ہونے کے تاریخی لمحے پر مرکوز کر دی اور ہر طرح کے خوف اور شبہات کو ذہن سے جھٹک دیا۔

لندن کے پیٹھ روایر پورٹ پر میری بیوی بیٹا نے مجھے الوداع کہتے ہوئے کہا تھا کہ ”میں ہر لمحاظ سے خوش رہوں اور جو تحریر کرنے جا رہا ہوں، اس سے پوری طرح لطف اٹھاؤں۔ یہ ایک بڑی دلیرانہ ہم ہے، ایک ایسی مہم جس پر شاید تم دوبارہ کبھی نہ نکل سکو۔“ صرف آٹھ دن پہلے کی بات ہے جب ہم ہیئتھرو سے روانہ ہونے والے تھے۔ میری ڈھارس بندھاتے اور خدشات کے گھیرے سے نکل آنے کا کہتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ ”تم نے یہ سب، کچھ نہ ہونے سے شروع کیا تھا، صحرائے کنارے تک پہنچا بھی ایک بہت بڑی کامیابی سمجھی جائے گی، اس لیے تم جاؤ اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لو، تم ضرور کامیاب ہو۔“

گے۔ یہ ایک بے مثل معزکہ ہو گا۔ پچھلے اور میرے بارے میں فکر مند نہ ہونا، ہم ٹھیک ہیں، جو بھی صورت حال ہوئی، اس کا مقابلہ کر لیں گے۔“

بارنی رکا اور بولا، کہ وہ ہمیں بیہیں سے الوداع کہے گا۔ ہم نے باہم ہاتھ ملائے اس نے ہماری خوش قسمتی اور خوش بختی کے لیے اچھی تمنا کا اظہار کیا۔ ہم چل دیے تو وہ پکارا ”تم سے مزار تاغ میں ملاقات ہو گی۔“ اب میں اپنے مسئللوں میں الجھ گیا۔ بارنی کی اپنی پریشانیاں اور ذمہ داریاں تھیں، اسے اپنی گاڑی لانا اور کارروان میں شامل کرنا تھا۔ وہ شاہراہ ریشم سے مشرق کی جانب بڑھنے لگا۔ صحراء کے اندر پہنچ کر بھی اس نے ہمارے ساتھ مواصلاتی رابطہ قائم رکھا۔ وہ ہمیں کسی مشکل سے کیسے نکال سکے گا؟ دور دوستک پھیلے ہوئے ٹیلوں میں سے گاڑی چلا کر نکلتا، ممکن نہیں تھا۔ ہم دونوں نے دو تین ماہ تک اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔ اسی پر ہم کی قسمت کا دار و مدار تھا۔

مجھے پہلی بار صحرا کی خاموشی کا احساس ہوا، ایک خلا کی سی کیفیت تھی۔ ریت پر چلنے سے میرے پاؤں سے جوبے نام سی آواز آتی یا اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بجتے سے جوئن ٹن ہوتی وہ صحرا کے سناٹے میں خفیہ سی حرکت پیدا کرتی۔ میں نے روپرٹ سے رابطہ کیا، وہ طاقت ور اور اثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ ریت کے ٹیلوں پر چڑھتے اتتے میرے گھنٹے کی تکلیف بڑھ گئی۔ میں کب تک اس کے سہارے چل سکوں گا؟ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، فالٹے پر مارک اور بارنی کے ہیولے سے نظر آئے۔ بیرونی دنیا سے ہمارا یہ آخری رابطہ تھا! ہمارے سامنے ریت اور ریتلے ٹیلوں کا کہیں ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا۔ اس سے آگے کیا ہے؟ ریت کے سوا ہم کسی اور چیز کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاسکتے تھے۔ ہمارے ساتھ تیس اونٹ اور پندرہ افراد تھے اور ان کے پاس صرف 25 روز کا راشن اور پانی تھا۔ مزار تاغ پہنچنے کے لیے صرف بہنی زاد سفر تھا۔ ہم دو گھنٹے تک چلتے رہے رچڈ ہر ایک سے بہن بہن کر با تین کر رہا تھا، جیسے وہ صحرا میں نہیں کسی وادی میں مژگشت کرنے نکلا تھا۔ وہ بھی کبھار کسی ریتلے ٹیلے پر بیٹھ جاتا اور پھر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس نے سر پر ہیٹ، گھنٹوں تک نکل اور نیلے ریگ کی قیص پہن رکھی تھی۔ ہم چالیس سے ساٹھ فٹ اونچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہماری ٹیم کے ارکان اب کچھ مطمئن دکھائی دینے لگے، انہیں یہ احساس ہو گیا کہ صحرا کو عبور کرنے کا مقصد پورا ہو کر

رہے گا۔ گرمی انہا کو پہنچ گئی تھی۔ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں چند میل چل لیتا ایک کار نمایاں دکھائی دینے لگا۔ لاڈ زہاؤ کو راستے کے انتخاب کے بارے میں اختلاف تھا، قطب نما جو کچھ دکھارہا تھا، وہ اسے بھی مانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس صورت حال سے گھبرا گیا اور وقتی طور پر اس وہم میں پڑ گیا کہ شاید میں نے بھاری بوجہ اٹھالیا ہے۔ بعض ارکان کا کہنا تھا کہ ہم نے جان بوجہ کر اپنے لیے موت طلب کی ہے۔

ایک گھنٹے میں ہمارا کارروان اتنے فاصلے پر پھیل گیا کہ اس کا پھر سے یک جا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ایک ٹیلے کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھا، اونٹ ٹیلوں کے پیچے چھپ گئے تھے اور کوشش کے باوجود نظر نہیں آ رہے تھے۔ جہاں ٹیلے چھوٹے اور پست تھے ان میں سے کارروان سیدھا نکل گیا۔ لیکن جہاں ڈھلان اور زیادہ تر چھپی ہو گئی تھی، ان پر ساربانب اونٹوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے چنانچہ اونٹ ٹیلوں کے پیچے چلے جاتے اور دکھائی نہ دیتے۔

سہ پھر کو ایک اور اونٹ جس پر پانی لدا ہوا تھا، بے قابو ہو کر بھاگ نکلا، ساربانبوں کو خبر ہونے اور سنبھلنے تک 20 لتر کے ڈبے ٹوٹ گئے اور ان میں سے پانی بہہ گیا۔ ”پانی اسی رفتار سے ضائع ہوتا رہا تو اگلے تین ہفتوں میں ایک بھی ڈبے صحیح سلامت نہیں بچے گا۔“ کیتھ سر ہلاتے ہوئے بڑا کیا۔ رچڈ نے میرے پاس آ کر کہا سیون ہیڈن کا آغاز سفر بھی کچھ ایسا ہی ہے ترتیب تھا اور اونٹوں کے ساربانب بھی زیادہ مجھے ہوئے نہیں تھے۔ پانی کا ذخیرہ بھی کم تھا اور رہنمائی کا انتظام بھی تاقص تھا، بہر حال مشکلات ویسی کی دیکی تھیں، میں نے رچڈ سے ممنونیت کا اظہار کیا، اس نے کہا کہ ہماری شیکنا لو جی سیون ہیڈن کے مقابلے میں بہتر ہے۔ اس لیے ہم مسائل کو نسبتاً بہتر طور پر حل کر سکیں گے۔ ہم اپنی امدادی ٹیم اور انگلستان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں، جس سے ہماری کچھ مشکل آسان ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ صحراء کو عبور کر لیں گے۔ کیرولین نے کہا کہ اگر ہم زندہ نجع گئے اور صحراء کو پار کر سکے تو اس کا پیشتر اخبار ہمارے لوگوں، اونٹوں کی کارکردگی اور پانی کی دست یابی پر ہو گا۔

میں نے سوچا کہ ہمیں اپنی امدادی ٹیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پانی حاصل کرنا چاہیے اور اونٹوں کی اور اپنی تربیت کرنی چاہیے۔ انسان کی جبلت میں ہے کہ جو کچھ

میرے ہے اسے چندال اہمیت نہیں دیتا اور جو حاصل نہیں، اس کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، مجھے افسوس تھا کہ میں نے پانی کا مناسب بندوبست نہیں کیا تھا۔ یوں تو میں نے ہیڈن کے تجربات کو ملاحظہ رکھا اور ان سے فائدہ اٹھایا لیکن پانی کا انتظام کرنے کا معاملہ میرے ذہن بھی سے نکل گیا۔ ہیڈن نے لکھا تھا کہ اس نے پانی کے میکروں کو نقصان سے بچانے کے لیے ان کے گرد لکڑی چڑھائی، لکڑی اور بینک کے درمیان گھاس بھر دی، لکڑی اس لیے کہ بینک کو نقصان نہ پہنچے، دوسرے سورج کی شعاعیں برا و راست میکروں پر پڑ کر انہیں گرم نہ کر دیں۔

یہ انتظام پائیڈار ثابت نہ ہوا، ساربانوں نے گھاس نکال کر بھوکے اونٹوں کو کھلا دی۔ ہم چلتے گئے، کچھ ہی دیر بعد گانے کی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔ یہ ایک ساربان گارہ تھا۔ میں نے رچڑ سے کہا کہ ہم اگر گا بجا سکیں تو صورت حال اتنی سخت اور صبر آزمانہ رہے، ساربان کے گیت کے ہلکے سروں نے جیسے ہم پر سحر کر دیا ہو۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا کہ ساربان کو گیت گانے کا کہتے اور اسے سن کر ساری کلفتیں بھول جاتے۔

ایک دن ہم نے ساڑھے پانچ گھنٹے میں چھ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ صحرا کے معیار کے مطابق یہ ایک معیاری رفتار تھی۔ میں نے دورویہ ٹیلوں کے درمیان کی ہموار جگہ پر اگلے اونٹوں کو کھڑا اور باقی کے اونٹوں کے آنے کا انتظار کرنا شروع کیا۔ آخری اونٹ کے آنے میں آدھا گھنٹا لگا۔ ہم نے اونٹوں پر سے بوجھ اتارنا شروع کر دیا۔ سامان بے ترتیب سے بکھرا ہوا تھا۔ کہیں اونٹوں کے کچاوے تھے، کہیں سلپنگ بیگ تھے۔ اونٹ بوجھ سے نجات پانے کے بعد ادھر ادھر پھرنے لگے تھے۔ صحرا میں اترنے کے ابتدائی اقدامات کچھ ایسے برے بھی نہیں تھے۔

سورج ریت کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو گیا، ریت کا رنگ سفید دکھائی دینے لگا۔ شام کے سامنے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ریت پر نگلے پاؤں چلانا اچھا لگا، ٹھنڈی ریت پاؤں کی الگیوں کو چھوٹی تو نرخی کا احساس ہوتا۔ ساربان کنوں کھونے لگے، انہوں نے چھ فٹ کھدائی کی ہو گی، تھہ میں پانی آ گیا۔ اونٹوں کی پیاس بجھانے کا انتظام ہو گیا۔ آگے کیا ہو گا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ پانی مل گیا تھا اور کنوں کی کھدائی ممکن بھی تھی، اور پار آور بھی۔ سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ لاوزہاؤ پڑوں لگر پر گوشت پکارہا تھا۔ روپرٹ نے ریڈیو کے ذریعے امدادی ٹیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ کر

سکا۔ رچڈ کوئی چالیس فٹ اونچے ٹیلے پر خاکشی کا پیڑ لیے بیٹھا تھا۔ کیرولین ایک اونٹ کے نتھنے کو دیکھ رہی تھی جسے چوبی مہار نے چھاڑ دیا تھا۔ ان مہاروں کے ذریعے چار پانچ اونٹوں کو ایک دوسرے سے باندھا جاتا تھا۔ ان میں گانٹھ اس نری سے دی جاتی کہ اگر ایک اونٹ گر پڑتا تو مہار از خود کھل جاتی۔ دوسرے اونٹ کا نتھنا چھاڑنے کا سبب نہ فہمی، اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے اونٹ کا نتھنا زخمی ہو گیا۔ کیتھ فونو گرانی میں مصروف تھا اور میں کل کے سفر کے لیے رستہ متعین کرنے میں لگا ہوا تھا۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے سب کو اکٹھا کیا اور طے کیا کہ کون کیا کرے گا۔ چاند نکل آیا تھا، ہم سر جوڑے بیٹھے تھے، یوں لگتا تھا جیسے کوئی سازش کرنے میں مصروف ہوں، صحرا سے اس کے راز اگلوانے اور اس کے روایتی نام کو ہمیشہ کے لیے بدلتے دینے کی سازش۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ زمین پر ریت کے ٹیلوں کا سلسہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ ان آسمانی اور زمینی و سعتوں میں ہمارا کارروائی اور بھی چھوٹا لگنے لگا تھا لیکن ساتھ ہی اتحاد خاموشی تھی، جس نے باطنی امن، سکون اور طہانتی بخش دی تھی۔ صحرا کی رات نے مجھے اپنے دامن میں لپیٹ لیا تھا، میں نے جو سکون محسوس کیا، وہ دنیا میں کہیں اور مجھے میر نہیں آ سکتا تھا۔

میں نے رچڈ سے پوچھا، تمہارا پاؤں کیما ہے؟ اس نے جواب میں میرے گھنے کے بارے میں پوچھا، دوفوں کو درد ہو رہا تھا۔ کل جب اگلے پڑاؤ کے لیے سفر پر نکلیں گے تو ہم پر کیا بیتے گی؟ صبح ہوئی، سورج کی تیز اور شدید گرمی نے رات کی آسودگی اور تحفظ کا خاتمه کر دیا، وہ ہم پر اس تندی سے گرنے لگی تھی، جیسے ہتھوڑا بیخ پر گرتا اور چوٹ لگاتا ہے۔ کیتھ نے اپنا پڑوں گرچھانے سے پہلے ہمیں جگانا شروع کر دیا۔ چینیوں نے ناشتہ تیار کرنے کا ذمہ لیا تھا لیکن وہ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا، خود نہیں جائے تھے، انہیں جگانا پڑتا تھا۔ یہ ذمہ داری ہمیں نبھانا پڑ گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ سارے بانے، نماز ادا کرنے کے لیے ٹیلوں کے درمیان کھلی جگہ تلاش کر رہے ہیں، نماز پڑھ پکھے تو انہوں نے اونٹوں کو گھیر کر لانے کی کاوش شروع کر دی، رات کو اونٹ اور ہر اچھیل گئے تھے۔ مشرق و سطی میں بدو اپنے اونٹوں کی اگلی نانگوں کو باندھ دیتے تھے لیکن یہاں ایسا نہیں کرتے، جس کے سبب سے اونٹ میلوں دور تک چلے

جاتے ہیں، انہیں پکڑ کر لانا بڑا مشقت طلب کام ہے۔ اونٹ لائے گئے اور انہیں بھاکر سامان لادنا شروع کیا گیا۔ یہ بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ غیر متوازن بوجو، اونٹوں کے لیے تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ اس کے گرنے کا بھی اندریشہ رہتا ہے۔ اس لیے ہر چیز ایک ترتیب کے ساتھ رکھی اور باندھی جاتی ہے۔ کچھ اونٹ تو بھاری بوجہ لادنے پر بھی کسی ناگواری کا اظہار نہیں کرتے۔ چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن بعض اونٹ مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ سامان اتارنا اور لادنا خاصا وقت طلب کام ہے۔ اسے مل جل کر ہی کرنا پڑتا ہے۔ صبح سفر کی تیاری میں کم سے کم دو گھنٹے لگتے ہیں۔ تیس اونٹوں کو سنبلانہ، کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں خاصی محنت لگتی ہے۔ پہلے انہیں پکڑ کر لانا، ہر اونٹ کو اس سامان کے قرب لا کھڑا کرنا ہے اس پر لادنا ہوتا ہے۔ پانچ چھ آدمی مل کر ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس صبح میں نے کیولاں کو دیکھا، وہ ایک طرف بیٹھا اپنے کیمرے اور سامان کو دیکھنے میں مصروف تھا، اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ اس نے سفید جیکٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی، مجھے وہ اچھا نہیں لگا، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، یہ میری اپنی ہم تھی، ٹیم کے تمام ارکان میں نے خود پختے تھے۔ فوٹو گرافر ہم پر مسلط کیا گیا تھا۔ ٹیم میں کوئی نہیں تھا، جو اسے اچھا سمجھتا ہو، رچڈ سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ سب سے الگ تھلگ رہے۔ اسے ٹیم میں لانے اور متحرک کرنے کی تدبیر کرنا لازم تھا۔

سامان اونٹوں پر لادا جا چکا، ساڑھے دس کے قریب ہم نے سفر شروع کیا۔ درج حرارت ۹۰ درجے فارن ہائیٹ تھا، ہوا نہیں تھی، پیاس شدت سے محسوس ہونے لگی تھی، میں نے دو میں سے ایک بوٹل سے سیر ہو کر پانی پیا۔ اونٹ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ٹیلوں کے گرد خاصا فاصلہ تھا، اونٹوں کو ایک دوسرے سے باندھے رکھنے والی ری ٹوٹ جاتی تو پھر سے باندھنے کے لیے پورے کارروال کو رک جانا پڑتا۔ ہم بڑی حد تک جان چکے تھے کہ کون سے اونٹ پر کون سا سامان لادنا موزوں ہے، پھر بھی غلطی کا امکان رہتا، دو اونٹ رسہ تڑا کر بھاگ لکھے۔ ان پر پانی نہیں تھا، غلہ تھا۔ دو بوریوں سے غلہ باہر گرنے لگا۔ ان بوریوں کو پھر سے سینے میں وقت بھی لگا اور محنت بھی۔ ہم تیری مرتبہ ستانے کے لیے بیٹھے۔ گری اپنی انہیا کو چھور ہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے جسم میں جان نہیں رہی۔ ایسے میں روسا اٹھا وہ ایک اونٹ کی پیٹھ پر بندھے ہوئے سامان میں سے ایک بڑا ساتر بوز نکال لایا۔

اس نے اس کے ٹکڑے کیے اور ہم میں بائٹ دیے۔ اس کے سرخ گودے کا ایک ایک ریتہ اور اس کا ایک ایک قطرہ ہمارے لیے قیمتی تھا۔ قطرہ گرتا تو ساتھ ہی ریت میں جذب ہو جاتا۔ چلپلاتی دھوپ میں اور آگ کی طرح گرم ریت پر، ہم نے تربوز کی ایک ایک قاش بڑی رغبت سے کھائی۔ ہماری کوشش ہوتی کہ اس کا رس جتنی دیر منہ میں رکھ سکتے ہیں، رکھ لیں۔ اس کے بعد ہی پیٹ میں اتاریں۔

اس وقت تک روپورٹ اور کیتھ، جو ہمارے آگے آگے چل رہے تھے، نظر وہ سے اوچل ہو گئے۔ میں نے تربوز کی دو قاشیں لیں اور ان کے پیچے ہولیا۔ میرا گھٹنا درد کر رہا تھا اور سر گرمی کی وجہ سے گھوم رہا تھا۔ ایک تو سورج کی سیدھی گرمی تھی، دوسرا ریت پر سے منعکس ہو کر آتی تھی۔ میرا تو دل ڈوبنے لگا۔ کیا ہم صحرا کو عبور کرنے کے لیے 780 میل کا سفر کر سکیں گے؟ میں آگے بڑھتا گیا۔ ریت کے میلے تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے، ان پر کہیں کہیں کوئی چھوٹی سی جہاڑی اگ آئی تھی۔ یہ ہمارے سفر کا دوسرا دن تھا۔ ان دونوں میں مجھے صحرا کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا، ہر لمحے اس کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے تربوز کی ان دونوں قاشوں کی طرف دیکھا اور انہیں اور ان سے بننے والے رس کو کھا جانا چاہا۔ یہ ایک کڑی آزمائش تھی۔ کیا کیتھ اور روپورٹ کو کبھی اس آزمائش کا احساس ہوا تھا؟ میں نے دونوں قاشیں ریت میں پھیک دیں۔ انہیں کھا جانے کی شدید خواہش کے باوجود اپنی استقامت میں خنہیں آنے دیا۔ دس منٹ بعد کیتھ مجھے مل گیا، اس کا بھی گرمی سے برا حال تھا۔ لیکن وہ خندال اور خوش باش تھا۔ اس نے بتایا کہ روپورٹ آگے نکل گیا۔ ہم نے ایک دبائیں کیں اور خاموش ہو گئے۔ ہم غیر ضروری باتوں کو طول دے کر اپنی توانائی نہیں کھونا چاہتے تھے۔ میں چلتا گیا۔ صاف آسمان پر چلتا ہوا سورج، اپنی بے پناہ گرمی سے ہمارا گلا گھونٹ رہا تھا۔ دس منٹ اور گزرے ہوں گے کہ روپورٹ مل گیا۔ وہ ایک جہاڑی کے چھدرے سائے تیلے، شیم دراز تھا۔ سورج میں ہمارے سروں پر تھا۔ میں نے روپورٹ کو تربوز دیا، جو اس نے لیتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں نے گزشتہ بیس منٹ کے دوران میں کتنے ضبط سے کام لیا اور شدید خواہش اور طلب کے باوجود خود نہیں کھایا۔ ہم خاموشی سے پیٹھ گئے اور قافلہ کے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

اس دن مجھے اپنی طاقت ختم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے جسم سے پانی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن میرا کیا، دوسروں کا بھی یہی حال تھا۔ کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے پانی کی بوقت کا ڈھنکنا کھولا، اس میں بہت کم پانی بچا رہ گیا تھا۔ بس دو تین گھونٹ کا ہوا۔ مزید تین گھنٹے تک چلتے رہنے کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔ اس دن ہمیں بارہ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ بھی ہو، ہمیں یہ فاصلہ طے کر لینا چاہیے۔

ریوپرٹ پر کچھ اثر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ وہ قافلہ سے آگے چل رہا تھا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے اونٹوں کو لیے جا رہے تھے۔ ریوپرٹ سیدھا چلتا ہوا ریت کے ٹیلے پر جا چڑھا۔ ہم نے ایسا نہیں کیا، ٹیلے کے ساتھ چلتے گئے۔ میں نے اپنی ڈائری میں 25 ستمبر کی رووداد اس طرح لکھی۔

”عیسیٰ پوتا نے مجھ سے کہا کہ شام کو 5:30 پر رک جائیں کیوں کہ الگے دو دن کے لیے اونٹوں کو پانی نہیں ملے گا۔ ہم نے 7-8 میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ میں تو رکنے کے لیے تیار ہو گیا، کیوں کہ میرے جسم میں پانی بالکل نہیں رہا تھا۔ مجھ میں کوئی سکت باقی نہیں تھی۔ ایک جگہ تو، جہاڑی کے قریب ریت پر گر پڑا اور کچھ ستایا۔ میں نے سوچا کیا میں اکیلا اس آزمائش کا سامنا کر سکوں گا؟ ریوپرٹ اور کیرولین کی حالت تو اچھی ہے، رچڈ تھک گیا ہے اور کیتھ چت پڑ گیا تھا۔ چینیوں کی حالت ہم سے اچھی نہیں تھی۔ اونٹوں سے بوجھا تارنا آسان نہیں تھا، ہم نے انہیں کچھ درپر کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور پانی کے لیے باری باری کنوں کھودنے لگے۔ دوسروں کے حال کا پتہ نہیں، میں مرد انگی کے زغم میں پھاواڑا چلاتا اور زمین کھو دتا رہا۔ اپندا میں ریت آسانی سے اٹھتی اور بکھرتی رہی، چتنا گڑھا کھودتے، اتنا ریت سے بھر جاتا۔ ہم ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی سُنی میں لگے ہوئے تھے جو کبھی پار آؤ نہیں ہو سکتی۔ ہر حال کھدائی کرتے رہے، دوشفتوں میں دو جگہ۔ پینے سے نہا گئے کوشش کرتے رہے، اس امید پر کہ قدرت رحم کرے گی۔

”اس رات ہم خوش قسمت تھے کہ تین فٹ پر گلی ریت نکل آئی۔ اسے مٹھی میں بھینپا تو بلبلوں کی صورت میں پانی نکل آیا۔ ابھی آدمی کھدائی ہوئی تھی، آدمی اور کرنا تھی۔ خدا کرے کہ جتنی کھدائی کر چکے ہیں، اس میں ریت نہ بھرے۔ جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ریوپرٹ میری بائیں جانب اپنے پاؤں کے آبلے سہلانے میں لگا ہوا ہے۔ کیتھ گہری

نیند سویا ہوا ہے، کیرولین نے میرے آبلوں پر پٹی باندھی ہے، جس سے مجھے آرام اور سکون ملا ہے۔ مجھے اور کیرولین کو میلوں دور سے گانے کی آواز آئی ہے۔ جیسا کہ روایت ہے صحرا کے دیوبھیں بلا رہے ہیں۔ ہم نے امدادی ٹیم سے ریڈ یو پر رابطہ کرنا چاہا لیکن نہیں کر سکے۔“ آئندہ چھ دنوں تک ہم ریت کے 1000 فٹ اونچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ لاوزاڈ کا کہنا تھا کہ ہم نے سات ٹیلے عبور کیے ہوں گے لیکن اصل میں 24 ٹیلے عبور کیے تھے۔ آگے ایک ساہی منظر تھا۔ 200 فٹ اونچے ٹیلوں کا ایک سلسلہ جو دو سیل چوڑا تھا، دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم اس سلسلے سے نکلے، ایک ہزار فٹ بلند ریت کے ٹیلے ہمارا راستہ روکے کھڑے دکھائی دیتے۔ ہم نے انہیں گنتاڑک کر دیا۔ ہمیں اپنے نشتوں یا سارے بانوں سے کوئی پتہ نہیں چلا تھا کہ کن مقامات پر پانی مل سکتا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ گرتے پڑتے چلتے رہیں۔ شاید کسی جگہ کھدائی کریں تو پانی مل جائے۔ ٹیم کے بربطاں نی رکن بڑے حوصلہ مند تھے۔ وہ سب سے آگے چلتے، اونٹوں کو تیکارتے اور ٹیلوں کے درمیان سے نکال لے جاتے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں کرتے تھے۔ میں ان پر فخر کرتا تھا۔ ان کے برعکس چینی دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ریت کے ٹیلوں اور گرمی نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ لاوزاڈ کو چھوڑ کر وہ سب قافلے کے پیچھے چلتے۔ جو ریت اونٹوں کے پیروں تلے آ کر باہم جڑ گئی تھی، اسے اپنی گزراگاہ بناتے۔ ریوپرٹ از اراہ مذاق کہتا کہ جو قافلے کے آخر میں چلتے ہیں، وہ اونٹوں کے گوبر کی زد میں رہتے ہیں۔ یہ تجھ تھا، آگے کی ریت زم تھی۔ اس لیے کہ اس پر انسانی یا حیوانی قدم نہیں پڑے تھے۔ اس پر چلنے میں بہت زور لگتا تھا اور تو انہی خرچ ہو جاتی تھی۔ ریت کے ٹیلے اونٹ سک پھیلتے چلے گئے تھے۔ ان سے نجکانہ ممکن نہیں تھا۔

ہمیں 26 ستمبر کو صحرا میں آئے تیسرا دن تھا۔ ریوپرٹ، رچڈ اور میں، ٹیلوں پر شدید اسہال کا شکار ہو گئے۔ ٹیلوں کو اجابت کے لیے بار بار جانا پڑتا تھا۔ اس صبح کو اونٹوں پر سامان لادنا تھا، پاخانے کے ساتھ بدبو کا بچپا اٹھتا۔ جس سے ہم بے حال ہو جاتے ریوپرٹ اور میں، تھوڑے ہی فاصلے پر رفع حاجت کے لیے بیٹھے تھے۔ ریوپرٹ نے کہا کہ پیٹ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو ابتداء ہے، آگے آگے دیکھنے ہوتا ہے کیا۔ اگلے چھ دن میں ہماری حالت پتلی ہو گئی۔ ہر گھنٹے اجابت کے لیے جانا پڑتا۔ بیماری

شدت اختیار کرتی گئی۔ جسم میں پانی کم ہو گیا۔ کئی صحنوں کو اونٹوں پر سامان لادنا مشکل ہو گیا۔ طاقت جواب دے گئی تھی۔ سارا جسم درد کر رہا تھا۔ جلد پھٹ گئی تھی اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔

ریوپرٹ یک بارگی آنکھوں سے اوچھل ہو جاتا۔ میں جانتا تھا کہ اسے رفع حاجت کے لیے جانا پڑتا ہے۔ لیکن اس نے شکایت نہیں کی۔ وہ بیماری کے باوجود اپنا کام بڑی تن دہی سے کرتا، اس نے یومیہ دو بوتل سے زیادہ پانی پینے سے انکار کر دیا حالانکہ ہمارے پاس ہنگامی حالت کے لیے پانی کی تیسری بوتل بھی تھی۔ اس کی ضداور انکار اور کسی قسم کی جسمانی کمزوری نہ دکھانے کی بنا پر میں اس سے ناراض ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہلنے جلنے سے ہی رہ جائے۔ کیرولین اکثر کہتی کہ بیماری یا لوگنے سے بچنا چاہیے اور اس ضمن میں پرہیز علاج سے بہتر کے مقولے پر عمل کرنا چاہیے۔ ریوپرٹ کا اصرار تھا کہ اسے اپنی مشکل خود آسان کرنے دی جائے۔ اسے مدد کی کوئی ضرورت نہیں، رچڈ ہم سب سے پہلے کمزوری کا شکار ہوا۔ لیکن اس نے بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کیا اور بھی مذاق جاری رکھا۔ پانچویں روز وہ شدید علیل ہو گیا۔ کیرولین نے پچھیں تشخیص کی۔ اس نے نہ گکر کرنا چوڑ دی۔ ہم اونٹوں کو ایک مشکل راستے پر لے جا رہے تھے۔ ریت اتنی نرم تھی کہ پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ اونٹوں کو تکلیف سے بچانے کے لیے، دو افراد کو ہشمائی پر مامور کیا گیا۔ رچڈ کبھی ریوپرٹ کی جگہ لیتا اور کبھی میری۔ اسے ٹیلوں کے دائیں باسیں اور کبھی اور پہنچ جانا اور بلند آواز سے بتانا پڑتا کہ کون سارا ستہ اختیار کرنا موزوں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اگلے اونٹوں کو صحیح راستے پر لے جانے کا بھی کام کرنا پڑتا۔ 110 درجہ فارن ہائیٹ میں، خواراک کی کمی اور پانی کے استعمال میں جزوی نے ہماری مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ اس روز ہماری طاقت اور جوش جواب دے گیا۔ ہم آرام کرنے کے لیے گر پڑے۔ سورج سے بچنے کی کوئی تدبیر اور صورت نہیں تھی۔ دھوپ کی شدت کے باعث ہماری جلد خشک ہو گئی تھی۔ ہم ریت میں دھنے ہوئے تھے۔ ریت ہمارے بالوں میں، ہمارے پورے جسم پر، ہمارے کانوں میں، آنکھوں اور منہ میں پڑی ہوئی تھی۔ ریت دانٹوں میں آ کر پس رہی تھی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہم زندہ تھے۔ قدرت نے ہماری زندگی کی ڈور کو طویل کر دیا تھا۔

رپوپٹ اور میں نے قافلے کی رہنمائی سنچال لی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ سفر جاری رکھا، ہم مشرق کی طرف بڑھنے لگے، اس خیال سے کہ ہمارا ہر قدم ہماری منزل کو قریب تر لرا ہے۔ ایک گھنٹا گزر گیا، اونٹوں میں سے صرف آدھے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم ٹھہر گئے۔ ایک اونٹ جس پر پانی کے دو کنٹیز لدے تھے، وہ اس تیزی سے پھسلا کہ پیچھے آنے والے اونٹ سے گلرا گیا۔ اس سے ایک کنٹیز میں سوراخ ہو گیا اور اس میں سے پانی تیزی سے بہنے لگا۔ ہم اگرچہ بس تھے، تاہم سوراخ بند کرنے کی جدو چہد کرنے لگے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ پانی کو ضائع ہونے سے بچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا کر جائے۔ میں نے کیتھ کی مدد سے سوراخ بند کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے ہمیں اونٹوں کو ہاتکنے والی چھڑی پر کپڑا باندھ کر سوراخ میں ٹھونٹنے کے سوا کوئی اور چارہ کا رجھائی نہ دیا۔ یہ طریقہ کام کر گیا۔ ہم تھک گئے تھے۔ شام ہونے تک ریت پر پڑے رہنے کی بجائے ہم نے سفر جاری رکھا۔ ہم ریت کے ٹیلوں سے ہار مانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم زیادہ دیر آرام کر سکتے تھے لیکن جتنا پانی لے کر چلے تھے، تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ دن ختم ہو جاتا تو اس تباہ کن گرمی میں ہم بہ مشکل تین روز زندہ رہ سکتے، رات کو سفر کر کے اس خطرے سے بچا جا سکتا تھا لیکن میں نے سوچ بچار کے بعد اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ رات کے اندر ہرے میں تیس اونٹوں اور پندرہ افراد کو اکٹھا رکھنا مشکل تھا۔ کسی ایک کے چھڑ جانے کا خطرہ بھی تھا، دن میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان سے گزرا نہیں آسان تھا۔ رات کو یہ ممکن نہیں تھا۔

جن اونٹوں کو چینی لا رہے تھے وہ تو پہنچ گئے لیکن کیرولین اور رچڈ کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ مجھے ان کی عدم موجودگی کا پہلے علم نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ آگے آگے چلتے رہے تھے۔ اب وہ کہاں رہ گئے؟ یہ خلاف معمول تھا۔ اس روز چینیوں نے اونٹوں کو ریت کے ٹیلوں میں سے گزارنے میں مدد نہیں کی تھی۔ اس پر میں ان سے ناراض تھا۔ ان کے برکس ہماری ٹیم نے مسلسل جواں ہمیتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ٹیلوں کے درمیان سے قافلے کو گزارنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اور یہ اس کے باوجود تھا کہ ہمارے تین ساتھی شدید پیچش میں بیٹلار ہے تھے۔ ہم نے چینیوں کو اپنی اس مصیبت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی مل جل کر کام نہیں کیا تھا۔ وہ ہماری بیماری کا جان کر کیا کرتے، انہوں

نے مل جل کر کام کرنے اور دوسروں کے کام آنے کا بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے ان پر ترس بھی آتا تھا کیوں کہ وہ رضا کارانہ طور پر ہم میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ انہیں شامل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ بعض اوقات ان کی آنکھوں سے افسوس جھلکتا دکھائی دیتا تھا، جانے وہ دل میں کیا سوچتے ہوں، دو نسلیں ایک طرح نہیں ہوتیں۔ برطانوی، بہادر، خطروں میں کو وجہ اور ہارنے ماننے والے ہوتے ہیں۔ جب کہ چینی شک کرنے اور اعتماد نہ کرنے والے اور بچوں کی طرح عدم تحفظ کے احساس میں بنتا رہنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی طاقت میں بھی فرق ہے، ان کا پس منظر اور تاریخ بھی مختلف ہے۔

45 منٹ بعد کیرولین اور رچڈ دکھائی دیے۔ ٹیلوں کے مقابلے میں وہ بونے نظر آتے تھے۔ گرمی کی شدت نے ان کا خلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پہلے لگا کہ وہ ہم سے بے خبر خوش گپیاں کرتے آ رہے ہیں، نزدیک آئے تو رچڈ بیٹھتے ہی گر پڑا۔ میں نے محض کیا کہ کچھ گڑ بڑھے۔ ”چارلس،“ کیرولین پکاری، ”آئیں دیکھیں رچڈ کو کیا ہو گیا ہے۔“ اس کے منه پر ہوا یاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بولا، ”معاف کیجیے، میں آپ کو انتظار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ ڈاکٹر (کیرولین) نے آ کر مجھے بچایا۔“ کیرولین نے بتایا کہ رچڈ قفلے میں بہت پچھے رہ گیا تھا۔ میں اس کی کمزوری بھانپتے ہوئے اس کے پاس گئی، وہ زمین پر پڑا ہوا تھا اور اپنے آپ سے باقیں کر رہا تھا۔ بعد میں رچڈ نے اپنی روایتی خوش طبی سے اپنے اوپر گزرنے والی واردات کہہ سنائی۔ اسے پچھش کا شدید دورہ پڑا تھا اور خاصی مقدار میں خون اس کے جسم سے خارج ہو گیا تھا۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس کے لیے ہلا جانا ممکن نہ رہا۔

اس حالت میں اس نے گزرے دنوں کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے ممباسا یاد آیا، جہاں وہ ہنی مون منانے گیا تھا۔ وہ گھرے نیلے سمندر کے ساحل پر لیٹا ہوا تھا۔ سامنے ساحل پر پرستگیری قلعہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی بیوی انتہیاریت پر چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی اس ذاتی کیفیت کے دوران میں رچڈ نے اپنی بیوی سے باقی کیس۔ اس اشنا میں کیرولین اس کے پاس جا پہنچی۔ اس نے ایک ہاتھ میں اس کے جو تے اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بوتل اٹھا لی اور اسے اٹھنے اور چلنے کے لیے کہا۔ رچڈ اٹھا اور نیگے پاؤں ریت پر چھوٹے چھوٹے قدم لے کر چلنے لگا۔ اس نے نیکر پہنی ہوئی تھی۔ اس کی

بیست کذاںی مشکلہ خیز لگ رہی تھی۔ وس منٹ بعد میں نے اُسے لاکھڑا تے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے ایک ٹیلے کی طرف بڑھا، وہ اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی حالت بہت پتلی ہو گئی تھی۔ اس کے سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہ تو ابھی آغاز تھا۔



باب 5

ضعف، بیماری اور ریت کے پہاڑ

مزارتانگ کی طرف ہماری پیش قدمی میں، ریت کے پہاڑ سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ہر دن کے آخر میں ہم جتنا کچھ سفر کر لیتے، اس پر ہمارے دلوں میں احساس تقاضہ پیدا ہوتا، ہمیں یاد آتا کہ سیوں ہی ڈن کو اسی طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انہی کے سب سے اس کا پورا مقابلہ تباہ ہو گیا تھا، ایول شین نے تو اونچے ٹیلوں تک پہنچنے کے بعد واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا، یوں کہ اس نے باور کر لیا تھا کہ انہیں عبور کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ بہر حال صحرائیں اپنی جادوئی کش مکش تھی، وہی انہیں وہاں لے آئی تھی۔ کبھی کھار بلند ترین ٹیلوں پر سے ٹھنڈی ہوا چلتی اور ہماری پیسے میں بھیکی قیصوں کو سکھا جاتی۔ کہیں گھرے کھڑ آتے جو ہمیں لرزاتے۔ روشنی اور سایوں کا کھیل الگ تھا۔ اونچی چوٹیوں کے سلسلے قطار اندر قطار تھے۔ بلند و بالا پہاڑ ہی تھے، جن کے درمیان نگ کو وادیاں تھیں۔ یہ سب شمال سے جنوب کی جانب چلتے تھے، مغرب سے مشرق کی طرف نہیں۔ خوبصورت تو تھے مگر خوف طاری کر دیتے تھے۔

ان ناموفق اور صبر آزم حالتیں جھگڑے ناگزیر تھے۔ یہ جھگڑے میرے اور چینی ساتھیوں کے درمیان ہوتے تھے۔ مگر اتنے شدید نہیں کہ طول پکڑ جائیں۔ بہت جلد نہست جاتے، ان کا ایک ثبت اثر یہ ہوا کہ میری قائدانہ حیثیت مسحکم ہو گئی۔ پہلا جھگڑا دن کے ختم ہونے پر اس وقت ہوا جب ہم صرف سات میل کا فاصلہ طے کر پائے تھے۔ راستہ دشوار گزار تھا، ہر کوئی سخت تحکم گیا تھا۔ عیسیٰ پوتا نے رچڑ

سے بدکلامی کی تھی۔ سبب یہ تھا کہ رچڈ نے کہہ دیا تھا کہ یہاں پانی نہیں ہے، کل بھی نہیں ملے گا۔ تیرے دن بھی پانی دست یاب نہ ہوا تو اونٹ مرنے لگیں گے۔ چوتھے روز وہ سب مر جائیں گے۔ یہاں کیا پیش آئے گا یہاں کیا ملے گا، کسی کے علم میں نہیں تھا۔ یہاں کوئی آیا ہی نہیں تھا جو ہمیں بتا سکتا کہ یہاں پانی مل سکتا ہے یا نہیں۔ یہ جگہ پڑاؤ کرنے کے لیے موزوں نہیں۔ سورج غروب ہونے میں ایک گھنٹا رہ گیا تھا۔ اس لیے چلتے رہنا چاہیے اور نیچے واڈی میں پونچ جانا چاہیے، ممکن ہے وہاں پانی ہو۔ تھوڑی سی حیص بیس کے بعد یہی طے پایا کہ جب تک روشنی ہے، ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔

ہم چل دیے۔ رچڈ نے آگے کے اونٹ کی مہار پکڑ لی اور اپنی کنزور حالت کے باوجود تیز قدموں سے اوپنچے ٹیلوں کی طرف بڑھنے لگا۔ چینی پیچھے پیچھے آپس میں چہ گوئیاں کرتے آ رہے تھے۔ روسا اور کریم میرے پاس آئے، ہم اس وقت ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ٹیم کے برطانوی رکن بہت مضبوط ہیں انہوں نے میری پیچھے چکلی اور پرے ہٹ گئے۔

ہم نے ایک شام ایک گلہ پڑاؤ لئے کافی صلہ کیا جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہاں کھدائی کریں تو پانی مل جائے گا۔ کھدائی شروع ہوئی لیکن ہر ایک بلا کا تھکا ہوا تھا۔ کسی میں طاقت ہی نہیں تھی، اس لیے کہاں میں ایک طرف ڈال دی گئیں۔ لاڈ زہاؤ اور گیو شام کا کھانا تیار کر رہے تھے اور ریڈ یو پر کسی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ میں اٹھا، دو کدالیں پکڑیں اور دو ٹیلوں کے درمیان ایک ایسی جگہ چھاپ کی تھے جم گئی تھی، میں نے کنوں کھودنا شروع کر دیا۔ کیولائی نے پوچھا کھدائی ہو رہی ہے، میں نے کہا ہاں، اور اسے ایک کدال پکڑا دی کہ آؤ تم بھی اس کام میں حصہ بٹاؤ، اس نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے، کھدائی جاری رکھی، اسی اثنا میں کیرولیں، کیتھ اور امیر آگئے اور کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو امیر کے ہاتھ میں وہی کدال تھی جو میں نے کیولائی کو دی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر کمپ کی طرف دیکھا، جو ایک ہموار ٹیلے پر قائم کیا گیا تھا۔ کیولائی کھانا تیار کرنے کی جگہ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میری اس سے آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے اسے گہری نفرت آمیز نظروں سے دیکھا، میں چاہتا تھا

کہ وہ دوسروں کو بھی بتائے کہ میں ناراض ہوں۔ لیکن اس نے منه موڑ لیا اور کچھ ایسا تاثر دیا کہ وہ اپنے ضمیر میں کوئی چیجن محسوس نہیں کر رہا، میں غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے ک DAL ایک طرف پھینک دی اور لمبے لمبے قدم بھرتا یک پ کی طرف چل دیا۔ میں نے کیوالی کو بلند آواز سے کھدائی کرنے کے لیے کہا تھا، تمہیں یاد ہے پانی نہیں ملا۔ اس نے کہا کہ میں بیمار ہوں، میری ٹانگوں میں سخت درد ہے۔

میں نے کہا کہ میری دونوں ٹانگیں زخمی ہیں۔ میرا پیٹ بھی خراب ہے، تم جاؤ اور کھدائی کرو۔

”تم مجھے حکم نہیں دے سکتے۔“ کیوالی نے پینترابدلا

”میں حکم دے سکتا ہوں،“ میں مہم کا قائد ہوں، تم نہ فکر نہ کرو، کھدائی شروع کرو۔“

میں نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اس طرف دھکلیلا جہاں کھدائی ہو رہی تھی، اس نے ایک گھنٹا کھدائی کی، وہ انکار کر دیتا تو میں اس کا کیا کر لیتا۔

ایک بار رچڈ نے غصے میں آ کر مجھے اور روپرٹ کو برا بھلا کھانا شروع کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ جب ہم رہنمائی کرنے کے اہل ہی نہیں تو پھر اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہیں، روپرٹ، وسیع میلے کے باسیں جانب کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے گیا، جس میں کم سے کم رکاوٹ پیش آنے کا امکان تھا۔ میں سیدھا چلتا گیا۔ ہمارے دامیں جانب ایسے عمودی میلے تھے جو بالکل سیدھے اور پر چلے گئے تھے۔ ان کے اوپر کی سطح جنوب کی جانب سیدھی، ڈھلوان تھی۔ روپرٹ من مانی کرنے میں فرد تھا۔ وہ جس طرف چاہتا، چل دیتا۔ اس کا چیچھا کرنا ممکن نہیں تھا۔

میری بات سنے بغیر وہ اپنے چھاؤنوں سمیت ایک گھرے کھڈ میں اتر گیا۔ دور کی جانب وہ نمایاں ہوا، وہ ایک اپیسے راستے پر بڑھنے لگا جس پر چلتے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کیرو لین اس کے ساتھ چل رہی تھی، اس لیے نہیں کہ اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا، آسان اور مناسب تھا بلکہ اسے روپرٹ کی صحت کے بارے میں تشویش تھی۔

میرے لیے یہ بات باعث تسلیکن تھی کہ باقی ماندہ اونٹ اور ان کے ساری بان میرے راستے پر آ رہے تھے۔ میں نے دور رچڈ کو آگے بڑھتے اور اونٹوں کو دشوار راستے پر لے کر چلتے دیکھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ تنے ہوئے رستے پر چل رہا ہو۔

میں نے زور سے آواز لگائی، رچڈ، گدھے مت بنو، واپس آ جاؤ، جس راستے پر ہم چل رہے ہیں، یہی صحیح راستہ ہے۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور چا، چا کہہ کر اونٹوں کو چلتے رہنے پر ابھارتا رہا۔ کیرولین نے ایک بھی چھڑی پکڑی ہوئی تھی، وہ اس سے اونٹوں کو ہاتک رہی تھی۔ وہ اوپر ہی اوپر چلتے گئے، حتیٰ کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ عزم و ہمت کا شان دار مظاہرہ تھا، اس نے اونٹوں کو سیدھی ڈھلوان پر اوپر لے جا کر بظاہر ایک ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا، اس سے چند سو گزارے ایک سیدھی چٹان تھی۔ اس کی تراہی میں چاند کی شکل کا ایک گڑھا تھا۔ رچڈ اور اس کے چھاوٹوں کے لیے بیہاں آ کر رقم جانا، فطری تھا۔ ایک اونٹ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ لڑکھڑا کر ریت میں گر گیا اور اٹھنے کی کوشش میں دھاڑنے لگا۔ دوسرے اونٹ پیچھے کی طرف ہٹے اور ان کی تالیں گھٹتوں تک ریت میں ڈھنس گئیں۔ میں بڑی تشویش کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ باقی کے اونٹ، سامان کے ساتھ ڈھلوان سے نیچے کسکتے چلے جائیں گے۔ رچڈ اور کیرولین کے لیے گرے ہوئے اونٹ کو اٹھانا اور دوسرے اونٹوں کو سنبھالنا بہت مشکل کام تھا۔ میں پورے زور سے پکار رچڈ حماقت کرنا چھوڑ دو، واپس آ جاؤ، جس راستے پر تم جا رہے ہو، وہ تمہیں کہیں بھی نہیں لے جائے گا۔

اس نے جواب میں سمجھ کہا لیکن میں سمجھ نہیں پایا، اس نے ماہیوی کے عالم میں اپنی چھڑی ریت میں پھینک دی، اپنا ہیئت اتنا را اور پیٹھ گیا۔ کیرولین اس کے پاس گئی، اپنا بازو اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس کا یوسہ لے لیا۔ میں اس کی مدد کے لیے جانا چاہتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ پدل دیا کہ اسے اپنا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ بالآخر دنوں نے اونٹوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انہیں واپس اس راستے کی طرف موڑ دیا، جو میں نے اختیار کیا تھا اور جس پر چلنے کے لیے اس سے کہہ رہا تھا۔ اس واقعہ پر ہم رات کو بڑی دیر دل کھول کر ہستے رہے۔ روپرٹ نے کہا اسے ایک بار یقین ہو گیا کہ اونٹ رچڈ کے پیچھے چلتے ہوئے تکلامکان صحرائی سب سے اوپر چوٹی پر چڑھنے کے لیے گیس ماسک پہننے لگے تھے۔ اس طرح کی باتیں رچڈ سے ٹھٹھول کرنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔ رچڈ معدترت خواہ تھا تاہم اس کا کہنا تھا کہ اس نے اونٹوں کو

ہائکٹے ہوئے اوپر ہی اوپر جانے کی جو سعی کی، وہ اس پر نادم نہیں۔ اور کچھ حاصل ہوا یا نہیں، کیرولین نے اس کا جو بوسہ لیا، وہ کچھ کم نہیں۔ وہ اسے حاصل مخت کہہ سکتا ہے۔ یہ رچڈ کی آخری کوشش تھی اس نے اب تک جو مشقت کی تھی کچھ اس کے سبب سے اور کچھ پچیش کی شدت کے باعث اس کے جسم سے تو انائی جیسے نخودگی ہو۔ ہم تینوں کا پچیش میں بٹلا ہونے کا ایک سبب وہ فرانگ پین تھا جس میں ہر روز صبح کا ناشستہ اور شام کا کھانا پکایا جاتا رہا تھا۔ دن میں یہ پین اونٹ کے کچاوے میں باندھ دیا جاتا، اس پر گرد اور ریت اڑاڑ کر ہتی، رات کو جب سمجھی سونے کے لیے چلے جاتے، اسے کھلے میں رکھ جاتے، ٹیم کے برطانوی ارکان صبح جلدی جاگتے، وہ پین کوریت سے جلدی جلدی صاف کر کے، ناشستہ تیار کرنے کے لیے رکھ دیتے، شام تک یہ پین، اونٹ کے کچاوے میں بندھا رہتا۔ شام کو پھر کھولا جاتا اور کھانا پکانے کے لیے استعمال ہوتا۔ سارے بانے کبھی کبھی اسے اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے بھی استعمال کر لیتے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے انہیں بتایا کہ اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے برتن موجود ہے، صرف اس میں اونٹوں کو پانی پلاایا جائے۔ پین، انسانوں کے لیے ہے اسے اس غرض سے استعمال کیا جانا چاہیے ناصاف پین میں پکنے والا ناشستہ اور کھانا، رچڈ، روپرٹ اور مجھے بیمار کر گیا۔ جس روز اونٹ کو ذبح کیا گیا، اس سہ پہر کو ہم پھر سفر پر لکھے۔ ریتلے تو دونوں کا جنم بہت بڑھ گیا تھا۔ جسم کی تو انائی ختم ہو جانے کے باعث ہم بے جان ہو گئے تھے۔ آج یہ چوتھا دن تھا کہ ہم پانی تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہم نے ایک ٹیلے پر پڑا کیا اور اونٹ کا گوشت کھایا۔ 100 فارن ہائیٹ کے درجہ حرارت میں سٹیٹ سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر آٹھ سے دس گھنٹے تک چلتے رہنا بہت مشکل تھا۔ دن بھر کے لیے پینے کا تین لتر پانی بالکل ناکافی تھا۔

صحرائیں پہلے ہفتے کے دوران میں ہم نے صرف 70 میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ ہمیں اس مختصر سے عرصے میں بہت کچھ سیکھنے کے موقع میر آئے۔ برطانویوں اور اونٹوں کے سارے بانوں کے درمیان قرب دیگانگت کا احساس بڑھا، جہاں تک چینیوں کا تعلق ہے، وہ احساس کم تری کا شکار تھے۔ یہ سکنیاںگ پر ہان قبیلے کی صدیوں کی حکمرانی کا نتیجہ تھا۔ عیسیٰ پولتا نے ایک دفعہ ہمیں بتایا کہ وہ صحرائے کو عبور کرنے کی ہم

میں کیوں شامل ہوا ہے، ایک سال قبل جب مہم کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی، مارکیٹ کے میسر نے گیوجن والی سے کہا کہ عیسیٰ پوتا ان چند لوگوں میں سے ہے جو صحراء کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، دوسرے وہ اونٹوں سے کام لینے کا بھی ماہر ہے۔ گیو مارکیٹ کے قرب و جوار میں عیسیٰ پوتا کے گھر آیا اور اسے مہم کے بارے میں بتایا۔ عیسیٰ ساری پاتنی غور سے سنتا رہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں کہا کہ اس نے 76 برس کی عمر میں سات بار صحراء میں سفر کیا ہے اور ہر بار ذکر اٹھائے ہیں۔ جس مہم کا آپ ذکر کر رہے ہیں، یہ نامکنات میں سے ہے۔ اب سے پہلے کسی نے اس پر نکلنے کی جہارت نہیں کی۔ اس نے صحراء متعلق جو کچھ سننا تھا، وہ سب کچھ سنادیا۔ صحراء صدیوں سے روایات کا موضوع تھا، اس صحراء میں جو بھی گیا، زندہ سلامت واپس نہیں آیا۔ اس نے روایات کی توثیق کے طور پر ہیڈن کی ناکام مہم کا حوالہ دیا۔ یہ مہم، اس کی پیدائش سے 22 برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ غالباً اس کے بڑوں نے مارکیٹ میں دور ویہ کھڑے ہو کر اس مہم کو اسی طرح الوداع کہا تھا جس طرح اب آپ کی مہم کو کہا گیا ہے۔ گیونے سوچا کہ عیسیٰ مہم پر نہیں جانا چاہتا لیکن آخر میں اس نے کہا کہ نہیں میں جاؤں گا۔ میں اس سرزی میں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں میں جوانی کے ایام میں شکار کھیلتا رہا ہوں۔ مزار تاغ کا سلسہ کوہ بھی میرے لیے کشش کا موجب ہے۔ یہ میرے آبا و اجداد کی جولان گاہ رہے ہیں۔ میں مرنے سے پہلے وہاں ہو آنا چاہتا ہوں تاکہ سکون سے مر سکوں۔ رچڑ کا خیال تھا کہ عیسیٰ جی جان سے چاہتا ہے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں صحراء میں دُن ہوں۔ اس خیال نے ہمارے اپنے زندہ رہنے کے امکان کے بارے میں ٹکوک پیدا کر دیے۔ ہم ریتلے پہاڑی سلسے کو قریباً عبور کر چکے تھے۔ سارباں، مزار تاغ کے پہاڑوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ ہم پڑا ذائقے تو وہ آ کر پوچھتے۔ ”ہم کہاں پہنچے ہیں، مزار تاغ کے پہاڑ بیہاں سے کتنی دور ہیں؟“ نفیث کو دیکھ کر پوچھتے ”لوکیں تاغ، ہامت تاغ، گیوکل تاغ اور مزار تاغ“، کہاں ہیں۔“ یہ نام ان تک صدیوں سے سینہ بہ سینہ پہنچتے۔ ان میں سے ہر ایک نفیث پرانگی رکھ کر پوچھتا یہ مقامات کہاں ہیں؟ ان میں سے کسی نے بھی، ان مقامات یا پہاڑوں کو پہلے دیکھا نہیں تھا۔ اس ساتھا اور وہ بھی نہ لآ بعد نہ لآ۔ مگر سبھی ان تک پہنچنے اور انہیں

دیکھنے کی چاہت میں غلطان تھے۔ وہ جہاں بیٹھتے یہ نام پار پار دھراتے، جب بھی یہ نام ان کی زبان پر آتے، تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

اس شام ہم نے پڑاؤالا، اونٹوں پر سے سامان اتنا را، یہی معمول تھا۔ ہر کوئی خاموش تھا۔ کبھی تھکے ہوئے تھے۔ جن کے پیٹ خراب تھے، ان کی حالت اور بھی پتی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

”کیا منظر ہے؟“ ہم نے کیتھ کو کہتے سناء، ہم نے دیکھا کہ شماں کی جانب سب سے اوپری چوٹی پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ عیسیٰ پوتا تھا، کارروان کے رکنے سے پہلے ہی وہ الگ ہو گیا تھا اور کئی ٹیلوں سے گزرتا ہوا اس چوٹی تک جا پہنچا تھا۔ ٹیلوں کا یہ سلسلہ بے حد خوبصورت تھا۔ ان کی چوٹیاں سیدھی تھیں اور سائے، غروب ہوتے ہوئے سورج کے ساتھ لبے ہوتے جا رہے تھے۔ عیسیٰ وہاں بیٹھا مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ رچڑا اگرچہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر یہ منظر دیکھا اور کہا کہ ”لگتا ہے عیسیٰ اللہ کے حضور عبادت کر رہا ہے اور اپنے اجداد کی سرزین کو آخری بار دیکھ رہا ہے۔ اللہ اس پر رحم کرے۔“

پانی نایاب تھا، نہ ہم نہ سکتے تھے، نہ منہ ہاتھ دھو سکتے تھے۔ ہمارے بالوں پر مٹی جم گئی تھی اور انہوں نے لٹوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہمارے جسم پر ریت ڈھری جلد کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ کھلے اور بند سامان میں کوئی شے ایسی نہ تھی جس پر ریت کی تہہ نہ چڑھ گئی ہو، کیمرے اور آواز ریکارڈ کرنے کے آلات، جو بی بی سی نے دیے تھے سب کے سب جام ہو گئے تھے۔ لیکن یہ توروز کا معمول تھا۔ سب کچھ وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لاوزہا نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا ”جیرت ہے کہ کیوں لیوں پہاڑوں سے آنے والا پانی حکلامکان صحرائیں کیوں نہیں پہنچ پاتا۔“ اس کا نظریہ تھا کہ پہاڑ حرکت کرتے اور پانی اٹھ لیتے رہتے ہیں جو سیلاں کی صورت بر صفیر پاک و ہند اور پنکھہ دلیش کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ میں نے کہا کہ اس نظریے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ عام آدمی کے لیے جو سائنسی علم نہیں رکھتا، اسے سچا مان لینے میں کوئی تکلف نہیں۔

دن گزرتے رہے، ہم نے اونٹوں سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔ وہ کبھی کبھار

بھاری سامان گردیتے، تند و تیز اونٹوں پر ایسا سامان لا دا جاتا جس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا اندریشہ نہیں ہوتا تھا، مثال کے طور پر خیسے، لباس اور ذاتی استعمال کی اشیا وغیرہ۔ جو اونٹ زیادہ تیزی نہیں دکھاتے تھے، ان پر پانی کے کنٹیز لادے جاتے، ان کے درمیان مناسب فاصلہ بھی رکھا جانے لگا۔ تاکہ ایک دوسرے سے نکلا کر یا ایک دوسرے پر گر کر پانی ضائع نہ کر سکیں۔ شروع شروع میں ہمیں یہ حادثہ پیش آ چکا تھا جس سے سیکھا کہ جن اونٹوں پر پانی رکھا ہو، انہیں ایک دوسرے کے پیچھے نہیں چلانا چاہیے۔ صبح اونٹوں پر سامان لا دنا، خاصا دشوار اور مشقت طلب ہوتا تھا، اب ہم نے ایک وقت میں دو اونٹ لا کر ان پر سامان لا دنے کے لیے چار چار افراد سے کام لیئے کا طریقہ اپنایا جو کامیاب ثابت ہوا۔ جب ہم پیچش میں بٹلاتے تو سامان اتارنے اور لا دنے میں سخت دشواری پیش آتی۔ جن ایام میں رچڑ سے مشقت لینا چھوڑ دیا گیا وہ رے چلنے اور غلاظت وغیرہ ٹھکانے لگانے کا ہلاکا کام کرتا۔ چینی اور المخور غلاظت اور فضلہ پڑا رہنے دیتے۔ ہم زمین کھوڈ کر اسے دفن کردا ہیتے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ جہاں پڑاؤ کرتے، وہاں سے رخصت ہوں تو وہ جگہ پہلے کی طرح صاف ہو۔ ہم کے آخر تک ٹیم کے برطانوی ارکان گندگی کو زمین میں دباتے رہے۔ شروع شروع میں بڑی کراہت محسوس کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ عادی ہو گئے۔ جن مہموں میں مختلف نسلوں اور پس منظر کے حامل لوگ شامل ہوتے ہیں انہیں اس طرح کی مشکل پیش آتی ہے۔ لیکن اسے چندال اہمیت نہیں دی جاتی، جب جان پر پڑی ہو تو ساری توجہ اور کوشش جان بچانے اور اس ضمن میں ایک دوسرے کی مدد کرنے پر گلی رہتی ہے۔ کس نے کیا کام کیا، کون سا نہیں کیا، اس سلسلے میں ٹکوئے شکایتیں کم ہی کی جاتی ہیں۔

میں نے ہر روز ڈائری لکھنے کی عادت ڈال لی۔ پہظاہر یہ آسان کام ہے لیکن جب شروع کر دیا تو مشکل دکھائی دینے لگا۔ ایسا بھی ہوتا کہ لکھنا تو بعد کی بات ہے، قلم اور ڈائری اٹھانا دشوار لگتا۔ گزرے دن کے تجربات، احساسات کو قلم بند کرنے کے لیے جس ارتکاز توجہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ منتشر الدمامی کے باعث ہونہیں پاتی۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی خالی ذہن رہے اور گرد و پیش کا مشاہدہ کرتا رہے۔ لیکن ہمہ وقت کیمیرہ لیے بیٹھا رہتا وہ ہر منظر کے بارے میں سوچتا اور پھر اس کی تصویر بناتا، جو ہر

لخاظ سے مکمل ہوتی۔ میں کیتھ کی اس دلچسپی اور یک سوئی سے بہت متاثر تھا۔ درپیش امور و معاملات اور جذبات و محسوسات کو بڑی تفصیل سے قلم بند کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم میری کوشش ہوتی کہ جہاں تک بن پڑے میں ڈائری لکھنے کا کام پوری تفصیل کے ساتھ کر سکوں۔ چنانچہ ایک بار میں نے لکھا: آج میں نے پہلی بار سوچا کہ صحراء کبھی ختم بھی ہو گا یا نہیں، ابھی 600 میل کا فاصلہ طے کرنا باقی تھا اور میں کیا مفعکھہ خیز باتیں سوچنے لگا تھا۔ میں ریت پر چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ ہم اونٹوں کو پچکارتے اور رستے ٹیلوں پر سے گزارتے ہیکاں ہو گئے تھے۔ یہ ٹیلے 800 سے 1000 فٹ بلند تھے۔ یہ الپائن کے برفلیے دروں میں سے گزرنے کے متراوف تھا۔ ہماری ٹیم نے اچھا کام کیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور 9 میل کے بعد کمپ قائم کیا۔ ابتر حالات میں یہ کارگزاری اچھی تھی۔ آج دن بھر ہوا نہیں چلی تھی درجہ حرارت 95 فارن ہائیٹ رہا۔ لگا بھٹی میں سے گزر رہے ہیں۔ رچڈ کا پیٹ بدستور خراب ہے۔ روپرٹ کا بھی ویسا ہی حال ہے اسے ٹانگ میں بھی تکلیف ہے۔ رات کو درجہ حرارت 20 سے 30 فارن ہائیٹ تک رہا۔

بارنی سے ریڈ یو پر گپ شپ رہی۔ ”دی نائٹر، لندن“ کے لیے رواداد بھیجی۔ ایک اونٹ کا نتھنا پھٹ گیا ہے۔ یہ مہار کے کھینچنے کے سبب سے ہوا۔ سارے بان، اونٹ کی تکلیف سے لائق تھے۔ اونٹ کے نتھنے سے خون بہتا رہا۔ ایک تسلی نظر آئی وہ اس خطے میں کیسے اور کیا کرنے آگئی تھی۔ بے رنگ صمرا میں رنگ دار پیہرہن لیے ہوئے تسلی بھلی گئی۔ عبدالرشید کو لوگ گئی تھی اب اس کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ میں نے اسے اوڑھنے کے لیے ٹوپی دی تاکہ اس کا گھٹا ہوا سر دھوپ سے بچا رہے۔ ایک جگہ کارروان دو حصوں میں بٹ گیا۔ چینی ٹیم اور آدھے اونٹ ایک طرف چلے گئے۔ رچڈ اور میں نے اس تقسیم کے مضرمات کا جائزہ لیا اور اس کے خطرات کے پیش نظر اپنی مقررہ سمت پر چلتے رہنا ہی صحیح سمجھا۔ میرا گھٹا درود کرتا رہا مگر کام دیتا رہا اس کے اعصاب مضبوط ہو رہے تھے۔ مجھے اصل تشویش پیروں پر آبلے پڑنے پر تھی۔ چینی آج، دشوار گزار ٹیلوں پر لے جانے میں مصروف رہے۔ ایک اونٹ پھسل کر ایک گڑھے میں جا گرا، اس پر جو پانی کا کنٹیزر رکھا تھا، پھٹ گیا اور پانی

بہنے لگ۔ کیتھ نے بچا ہوا پانی دو خالی کنٹیزوں میں بھر لیا۔ پانی کا ضیاع گوارا نہیں، ہماری بقا پانی سے ہے۔ میں نے اپنی ٹیم کے ارکان سے کہا کہ ہمیں چینیوں سے صلح صفائی کے ساتھ رہنا چاہیے اور باہم تعاون کرنا چاہیے۔ ورنہ جو مشکل پیدا ہوئی، اس پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔

میں تاروں بھرے آسمان کے نیچ پدستور لکھ رہا ہوں، ٹینا اور بیٹھوں کے بارے میں کئی طرح کے خیالات ذہن میں آ رہے ہیں۔ میں ہر روز چلتے ہوئے بھی ان کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں بچوں کے مخصوص چہرے دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ واپس جا کر، اپنا بہت سا وقت ان کے ساتھ گزاروں گا۔ اب تک ان کی فرقت میں جو وقت ضائع ہوا ہے، اس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن ان کے باپ نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک دن اس پر فخر کریں گے۔

میں نے ڈائری ایک طرف رکھی، چت لیٹ کر، تاروں بھری رات کی وسعتوں کو خیال ہی خیال میں اپنی گرفت میں لینے کا سوچا، دن بھر کی مشقت اور قدم قدم پر پیش آنے والی مشکلوں کے بعد رات کا سکون، راحت کا موجب تھا۔ لوگ صحیح کہتے ہیں کہ عرب کی راتوں کا آسمان بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ میں نے مغربی چین میں بھی یہی محسوس کیا۔ یہاں کی راتیں بھی بڑی سحر انگیز ہوتی ہیں۔ ہم صحرائیں ریت پر، کھلے آسمان کے نیچے، اپنے ساتھیوں اور اونٹوں کے درمیان، سکوت و سکون کے ساتھ پڑے ہیں۔ ہماری روح اور ہمارے خیال پر کوئی قید اور کوئی روک نہیں، مختنڈی ہوانے میرے چہرے کی جلد کو جو دن میں وحصہ کی شدت کے باعث جل گئی تھی، سہلانا شروع کرایا۔

دن کی شدید گرمی، تپتی ہوئی ریت، انداھا کرنے والی روشنی، اکھڑتی ہوئی سانسیں، جسم کی کمزوری، ٹیلوں پر چڑھنے اور اترنے کی مسلسل کوشش کی یاد اور ساتھ ہی پیاس کی شدت محسوس ہونے لگی۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ہو کہ کیا ہم صحرائیں سے زندہ سلامت نکل سکیں گے۔



باب 6

شاہراہِ ریشم

مارک کیٹو نے مارکیٹ میں صحراء کے کنارے کھڑے ہو کر ہمارے کارروان کو نامعلوم کی طرف سفر کا آغاز کرتے دیکھا۔ اس کے جذبات ملے جلے تھے۔ اس نے صحراء کی وسعتوں میں تیس اونٹوں اور پندرہ افراد کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ صحراء کو عبور کرنے کی مهم شروع ہو چکی تھی۔ کیا وہ کامیاب ہو گی؟ اس خیال نے اسے لرزادیا۔ اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ اس بات پر سخت مایوس تھا کہ اس نے مہم میں کیوں شرکت نہیں کی۔ اسے پیچھے اور اکیلا رہ جانے کا افسوس تھا۔ وہ امدادی ٹیم میں شرکت کو اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ باری اور فرانس اس ٹیم میں شامل تھے اور اپنے کردار سے خوش تھے۔ مارک کو مہم میں شریک ہونا تھا۔ لیکن انگلستان سے رخصت ہونے سے دو ہفتے قبل میں نے اس کی جگہ روپرٹ برٹن کو لے لیا تھا۔ میری رائے میں مارک کی زبان دافی، شاہراہِ ریشم کے بازاروں میں چینی اہل کاروں سے معاملہ نہیں میں باری کے کام آئے گی۔ جہاں تک صحراء کا تعلق ہے، اس میں دو چینی ٹیموں کے ارکان انگریز زبان سمجھ لیتے تھے۔ ان سے بات چیت کرنا یا ان سے کام لینا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

وہ اپنی گاڑی کی طرف مڑا، ریت پر اونٹوں کے قدموں سے جو نشان پڑے تھے، ہوا نے انہیں مٹا دیا تھا۔ وہ اونٹوں کو دیکھنے کے لیے صحراء میں ایک میل گیا ہو گا۔ یہ چھوٹا سا فاصلہ طے کر کے اس نے محسوس کیا جیسے وہ صحراء کی پہاڑیوں تک ہو آیا ہے۔

مارک جیران تھا کہ ٹیم کے ارکان نے اپنے نقش قدم کو اتنی جلدی منئے دیکھ کر کیا محسوس کیا ہو گا۔

وہ واپس کیسپ میں پہنچا تو چینی امدادی ٹیم کو اس نے اپنا ساز و سامان گاڑیوں پر رکھتے دیکھا۔ چینیوں کا خیال تھا کہ ٹیم کے برطانوی ارکان ان سے مارکیٹ میں قائم مہمان خانے میں آٹلیں گے اور رات وہیں بسر کریں گے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ برطانوی ارکان، صحراء میں ستاروں کی چھاؤں میں شب بسری کے خواہش مند ہیں۔ چینیوں کے نزدیک آرام و آسائش کے اسباب کی موجودگی لازم تھی۔ جب کہ برطانوی ارکان کروں کی بجائے پیروں دار کھلی فضا میں رہنا پسند کرتے تھے۔ آنے والے ہمینوں میں برطانوی اور چینی ٹیموں کے درمیان اختلاف کی ایک بڑی وجہ ان کے طبعی روحانیات تھے۔

دوسری صبح کو چینی واپس مارکیٹ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ جو عمارت پوسٹ آفس کا کام دیتی تھی، اس کا نصف حصہ تباہ ہو چکا ہے۔ کاؤنٹر پر رہنے والی بورڈی خاتون مارکیٹ گئی اور وہاں سے رومال اور کپڑا لے آئی۔ جس میں ویڈیو شیپ اور فلمیں باندھی گئیں۔ یہ بیلا اور برطانوی پریس کو بھجوائی جانی تھیں۔ یہ پارسل چھہتوں میں اپنی منزل تک پہنچا اس وقت تک کئی اطلاعات زائد المیعاد ہو گئی تھیں۔

امدادی ٹیم کا معمول تھا کہ صحراء میں جانے والی پارٹی سے موصولہ بخوبی شام کے ریڈیو بلشن کے لیے بھجوایا کرتی۔ مارک نے اپنی بقا کے لیے ریڈیویائی رابطے کو شرط ٹھہرا لیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پیچگے میں ریڈیویائی مواصلات کا مرکز قائم کیا جس نے بڑی کوشش سے مختلف آوازوں میں سے روپرٹ کی آواز سننے میں کامیابی حاصل کر لی۔ وہ شال کی جانب سے ایک سو میل کے فاصلے سے آ رہی تھی۔ اس نے وہ روز ایک ہوٹل میں نتام کیا تھا۔ سینٹر ملٹری افروں نے جاؤں کی تلاش میں اس سے لپھیلی پوچھ گئی۔ اگلی دفعہ اس نے شہر سے میلوں باہر ایک خاموش جگہ کو ریڈیویائی رابطے کے لیے چنا۔ اس احتیاط کا مقصد یہ تھا کہ اس کے بارے میں ٹکوک و شبہات پیدا نہ ہوں۔ برطانوی اپنی ٹیم سے رابطہ کرتے تو چینی مصر ہوتے کہ انہیں بھی اپنی ٹیم سے رابطہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ان کی گفتگو زیادہ تر شدید گرمی اور ابتر حالات کے

بارے میں ہوتی۔

مارک نے روپرٹ سے پوچھا کہ صحرائے درجہ حرارت کتنا ہے۔ روپرٹ نے جواب دیا اتنا برا نہیں۔ 100 فارن ہائیٹ کے لگ بھگ ہے۔ گاڑی کے لاڈ پسیکر کی آواز میں جواب دب گیا۔ پھر یہ آواز گوئی کہ ہم گرمی کی شدت اور پیاس سے مرے جا رہے ہیں۔

بارنی کو زیادہ تشویش جان اور اینی تھامس کے بارے میں تھی، جو پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ دوسری گاڑی کے بغیر اس صحرائے وسعت میں اترنا ممکن نہیں تھا۔ روئی کار، ٹرک اور نسان جیپیں بارنی کی پنز گوار کے سامنے پیچ تھیں۔ پنز گوار ٹرک جس کامیابی سے صحرائے پاٹ سکتے تھے کوئی دوسری گاڑی نہیں پاٹ سکتی تھی، ان دونوں ٹرکوں پر ضروری سامان دور تک لے جایا جا سکتا تھا۔

جان اور اینی کی ابھی تک کوئی خبر نہیں تھی۔ 27 ستمبر کو بارنی امدادی ٹیم کو شاہراہ ریشم کے ساتھ مزید مشرق کی طرف لے گیا اور ہوتن سے پچاس میل مغرب میں رعاؤادی میں کیون لیون کے پہاڑی سلسلے کی تراہی میں جا پہنچا۔ یہاں سے وہ صحراء عبور کرنے والی ٹیم کے بارے میں بہتر معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ ہر یہ یا ای رابلے کے بعد وہ نقشہ پر ٹیم کے پہنچنے کے مقام کا قین کر لیتا۔ دوسری جانب سے جو نشریے آتے، ان میں اب کے پہاڑوں کو عبور کرنے میں درپیش مشکلات، پہنچ کے بھوٹ پڑنے کے احوال اور پانی کی ملاش کا تذکرہ ہوتا۔ امدادی ٹیم ہر اطلاع کا تجویز کرتی اور سوال کرتی کہ اس کے ہماری کامیابی کے ضمن میں کیا اثرات ہوں گے؟ بارنی سوائے دعا کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انگلستان میں جو اطلاعات پہنچاتا، ان میں بھی بتایا جاتا کہ مہم کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر جاری ہے۔ بارنی اپنی مایوسی کا اظہار نہیں کرتا۔ بھی تاثر دیتا ہے کہ ہر کام سلیقے سے ہو رہا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

وہ شروع سے ہی ایسا ہے، لندن میں اس کے گھر جاتے تو بڑے تپاک سے پیش آتا اور کہتا، آئیے آئیے، تشریف لایے، بتائیے میں آپ کے لیے کیا لاسکتا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں کچن میں لے جاتا جہاں اس کی بیوی مو، کھانا پکانے میں مصروف ہوتی۔ میں نے کئی بار پوچھا کہ اس کی بیگم کا اصل نام کیا ہے، وہ کہتا کہ یاد نہیں رہا۔

اس نے ہماری آمد سے چند منٹ پہلے ہی اپنی بیگم کو بتایا ہوتا تھا کہ دوست آ رہے ہیں۔ ان کے کھانے کے لیے کچھ تیار کرو۔

صرحاً عبور کرنے کی مہم کے سلسلے میں بھی اس کا کچھ بھی رویہ تھا۔ وہ بیک وقت تین اوقات کو ملاحظہ رکھتا۔ کاشغر کا، المغیر کا اور بیجنگ کا، نتیجہ عموماً یہ ہوتا کہ کوئی کام بھی وقت پر اور ڈھنگ سے نہیں کر سکتا تھا۔ ہر کام کرنے کے لیے طویل انتظار کرنا پڑتا۔

شاہراہِ ریشم کا نام بجائے خود گمراہ کن ہے۔ یہ چاگنگ این (موجودہ ذی آن) سے شروع ہوتی ہے۔ چین اور سلطی ایشیا کے درمیان تجارت کا زمینی راستہ ہے۔ جس میں مشرق اور مغرب کے درمیان کئی راستے باہم مل جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے ریشم سے کہیں زیادہ چائے، قیمتی دھاتوں اور دوسری اشیا کی نقل و حمل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ تمام چیزیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتی جاتی ہوں۔ کئی چیزیں درمیانی نگستانی منڈیوں میں ہی بک جاتی ہیں۔ یہ منڈیاں سوداگروں کے لیے کاروبار کے ایسے مراکز ہیں جن میں وہ اپنی زندگی پہنچ دیتے ہیں۔ ان کی آپس کی گفتگو سڑک کے بارے میں ہی ہوتی ہے۔ ”سڑک پر امن ہے۔“ ”کھلی تو ہے،“ ”بند تو نہیں۔“ جب بھی کوئی کارروان سفر شروع کرتا ہے تو اسے روایتی انداز میں الوداع کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں اس سڑک کے ذریعے جن منڈیوں تک تجارت ہوتی، ان میں روم کی منڈیاں زیادہ نمایاں اور پرکشش تھیں۔ شاہراہِ ریشم، شانی میں زمیان سے شروع ہوتی ہے اور صحرائے گوبی سے ہوتی ہوئی دون ہو یونگ تک پہنچتی ہے۔ ایک راستہ شمال سے جنوب کو جاتا ہے اور حکلامکان کی شمالی سرحد پر سے گزرتا ہے۔ تو رمان، کہنا اسکے بعد کاشغر شہر آتا ہے۔ شمالی راستے، جنوب مغرب میں کیون لیون کے شمالی پہاڑی سلسلے کی طرف نکل جاتا ہے اور پھر حکلامکان کی جنوبی سرحد پر میران، ریوکیا گنگ، رندری، ہوتن (کنہان) اور شاپی (یارقندم) کو پر دتا ہوا چلتا ہے۔ کاشغر میں دو شاخیں آ ملتی ہیں اور پھر مغرب کی جانب پامیر پر سے گزرتی ہوئی، ایران، عراق اور بحیرہ روم تک اور پھر بحری راستوں سے روم تک پہنچ جاتی ہیں۔

امدادیِ ریشم کے لیے کیون لیون کی سرسبز شاداب وادی میں قیام بڑا پُر لطف

رہا۔ پورا علاقہ سر بزرگ ختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ برف پوش پہاڑوں سے مختنے، میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے اور وادی کی ہریالی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں تک کیون لیون پہاڑوں کا تعلق ہے، وہ ڈھند میں چھپے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تکلا مکان صحراء سے اٹھنے والی ریت اس ڈھند کا سبب ہے۔

جان اور اینی تیسرے دن 30 ستمبر کو پہنچے۔ مہم کے شروع ہونے سے پورا ایک ہفتہ بعد۔ انہیں بھی راستے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ فتح کر آگئے۔ انہیں نیکسکور گان کی سرحد پر کاشغر میں دو دن رکنا پڑا۔ کشمیر والوں نے ان کی گاڑی پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے باری کے پیغامات اور کچھ اپنی سمجھ سے کام لیتے ہوئے ہوتن کا رخ کیا۔ رعا وادی کے بسرے پر انہیں آخری پیغام ملا اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ آئے۔

رعا وادی سے امدادی ٹیم نے ہوتن کی طرف سفر شروع کیا۔ ہوتن قدیم اور دل آؤز شہر ہے۔ اس کا بازار بہت خوب صورت ہے۔ قالمین بانی کا اہم مرکز ہے۔ اس کی خوب صورتی کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ سیاحت کی زد میں نہیں آیا۔ ہوتن ایک نخلستان کے گرد آباد کیا گیا ہے۔ یہ نخلستان دو دریاؤں کا مقام اتصال ہنا ہے۔ یہ دریا کیون لیون پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ نخلستان پچاس میل شمال میں باہم مل جاتے ہیں۔ بیہاں سے ان کا نام ہوتن دریا ہو جاتا ہے۔ مزار تاغ 120 میل اندر ورن کی جانب واقع ہے۔ بہار میں جب کیون لیون پہاڑی سلسلے پر برف کھلتی ہے تو یہ دریا جاگ اٹھتا ہے۔ ورنہ آہستہ آہستہ سمنٹا چلا جاتا ہے۔ امدادی پارٹی نے ہوتن کے بازاروں سے اونٹوں کے لیے غله اور مہم کے ارکان کے لیے کھانے پینے کی اشیا خریدیں۔ مہم سے ریڈیو کے ذریعے ہی رابطہ تھا۔ ورنہ اس کی حالت اس آب دوز جیسی تھی جو سمندر میں کہیں رک گئی ہو۔



باب 7

سلسلہ کوہ

روی سیاح پری جی والاسکی اور دو انگریز کیرے اور دال گیلش پہلے یورپی تھے جو 1885ء میں دریائے ہوتن کے مغربی کنائے پر مزار تاغ کے پہاڑوں تک پہنچے، ان سے دس سال پہلے سیون ہیڈن نے مارکیٹ سے مزار تاغ تک صحراء کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے پری جی والاسکی نے متاثر کیا تھا۔ جس نے ان پہاڑوں کا تذکرہ کیا تھا جو مزار تاغ سے مغرب کی جانب صحراء کی سمت پہلے ہوئے ہیں۔ اس نے لکھا تھا کہ پہاڑوں کو صحراء کی ریت نے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ ہماری نظروں سے او جھل ہو گئے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ یہ پہاڑ شمال مغرب کی طرف مڑ گئے ہیں۔ ان کا وسطی حصہ بہت اونچا ہے۔ ان پر سبزے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ان پہاڑوں کی تراوی کا علاقہ ریت میں دفن ہے۔ ہیڈن نے اس تذکرے سے بھی اخذ کیا کہ اگر ہم مارکیٹ سے مشرق کی جانب یا شمال مشرق کی جانب سفر کا آغاز کریں تو ہم مزار تاغ پہنچ جائیں گے۔ مقامی باشندوں کی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ پہاڑوں کے اس سلسلے میں ایسی جگہ ضرور ہے، جہاں ریت کے جھکڑ نہیں چلتے ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دن کے وقت سخت زمین پر چلتے ہوئے چشوں تک جا پہنچیں، جہاں سبزہ اور نباتات ہو اور قدیم تہذیبوں کی باقیات کے آثار بھی موجود ہوں۔ اس وقت جو نقشہ میسر تھا، اس کے مطابق ہیڈن نے یہ فاصلہ 200 میل بتایا تھا۔ اگر ہم ہر دن بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے لگیں تو یہ فاصلہ طے کرنے میں سولہ دن سے زیادہ نہیں لگیں

گے۔ درحقیقت ہیڈن کو صحرائی گرفت سے نکلنے کے لیے 26 دن گئے تھے۔ وہ شمال کی جانب نکل گیا تھا اور مشکل سے جان بچا سکا تھا۔ وہ مزارتائیگ کے پہاڑی سلسلے کو چھونے والے صحرائی عبور نہیں کر سکا تھا۔ اس نے صحرائی و سعتوں میں اپنے دوسرا تھیوں محمد شاہ اور قاسم اخون کو بھوک پیاس سے تڑپتے اور جان دیتے دیکھا، ان کے ساتھ آٹھ اونٹ بھی صحرائی سختیاں برداشت کرتے کرتے جان ہار گئے۔ ہیڈن کا کتا بھی نہیں بچا۔ جیسا کہ ہیڈن نے بعد میں لکھا: ”مہم کے ارکان ہوش و حواس کو بیٹھے اور ایسی حرکات کے مرتبہ ہونے لگے، جو کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھیں، وہ جان بچانے کے لیے اونٹ کا پیشاب تک پینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی ترغیب دی لیکن میں نے انکار کر دیا، ان کے جن تین ساتھیوں نے یہ پیشاب پی لیا، ان کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ پھر نہ سنبھال سکی۔ وہ قے کرتے کرتے مر گئے۔ ایک موقع پر قاسم نے ایک بھیڑ کی گردان پر چھری پھیری اور اس کی رگوں سے نکلنے والے خون کو ایک برتن میں بھر لیا، جسے ہم سب نے بڑی رغبت سے پیا۔“

اس کے بعد ہیڈن کے راستے پر کسی نے چلنے کی کوشش نہیں کی۔ ہیڈن کا کتا، اس کے اونٹ اور ان کے سارے بان صحرائی میں دفن ہو گئے تھے۔ ان پر انفاء کا پروہ تن گیا تھا۔ ہیڈن نے اپنی منصوبہ بندی اور تجربات کے بارے میں جو کچھ لکھا، ان سے سبق سیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن تفصیلات مفقود تھیں۔ بس قیاس کی بنیا پر تناخ اخذ کیے جا سکتے تھے اور صرف قوت ارادی کی بنیا پر صحرائی عبور کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ میرے اپنے اونٹ کے سارے بان عیسیٰ پولتا کا کہنا تھا کہ اس نے بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ مزارتائیگ کے پہاڑوں کے شمال کی جانب پہاڑی بکرے کا شکار کیا تھا۔ عیسیٰ کی معلومات اور تجربات سے کسی حد تک مفید معلومات حاصل کی جا سکیں، جن سے ہمیں امید بندی کہ شاید یہ ہمارے کچھ کام آ سکیں۔ شام کو بات چیت کے دوران میں کھلا کر عیسیٰ پہلے کبھی اس راستے پر آیا ہی نہیں تھا۔

تین دن پہلے اس نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ اس وقت ہم جہاں ہیں، ہمیں اگلے چار روز کے لیے پانی مل سکتا ہے لیکن یہ بھی غلط ثابت ہوا، ہمیں چھٹ کی کھدائی کے بعد تھوڑی سی مقدار میں پانی دست یاب ہوا تھا۔ اب مجھے یقین

ہو گیا کہ عیسیٰ کی پاتوں میں کوئی سچائی نہیں، ہمیں کیا درپیش آئے گا، کچھ علم نہیں تھا۔ جو کچھ بھی حاصل ہونا ہے، ہماری اپنی کوشش اور تنگ و دو سے ہی حاصل ہو گا، بس ہم کہیں جا رہے تھے اور وہ کچھ دیکھ رہے تھے کہ پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا تھا۔

ہماری ہر طرف، افق تک ریت اور ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ہم کہاں ہیں اس کے لیے سیٹلائز کے ذریعے رہبری حاصل کرنا چاہیے۔ جو بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی اس نے طول بند اور عرض بند کے حوالے سے یہ طے کر دیا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہیں مزار تاغ کے سلسلہ کوہ کے انتہائی مشرقی سرے پر پہنچ کر ہی طے کر پائیں گے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں، مارکیٹ سے ہم کا آغاز کرنے کے ساتوں روز یکم اکتوبر کی صبح ہم سب سے اوپری چوٹی پر پہنچے، جہاں سے مشرق کی جانب ہامتاغ، لوئیس تاغ گیوٹن تاغ اور مزار تاغ کے پہاڑی سلسلے دکھائی دیے۔ ہموار زمین تک پہنچنے میں مزید ایک دن لگے گا۔ سیون ہیڈن اس جگہ پہنچنا چاہتا تھا مگر نہیں پہنچ سکا تھا۔

اونٹ ڈھلان پر اترنے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ آیا ان ریتلے پہاڑوں تک آ سکیں گے۔ ہم پانچ روز سے انہی کے درمیان رہ رہے تھے۔ ان کی شکل جیرت انگلیز تھی۔ ہم نے چینجبوں کا ہر روز بڑی استقامت سے مقابلہ کیا تھا۔ ہم کھائیوں، کھٹوں، چوٹیوں کے گرد راستہ بناتے۔ سب سے اوپری اور ہموار جگہ پر پہنچے جہاں تیس اونٹوں کو بٹھایا جا سکتا تھا۔ سورج زیادہ بے رجی سے چمک رہا تھا اور تمیں جھلائے دے رہا تھا۔ ہمیں اوپرے یونچے راستے پر چلنا پڑ رہا تھا۔ گرد، پیسہ، گرمی، نانگوں کے کھنپے ہوئے پٹھے، پاؤں پر پڑے ہوئے آبلے، جسم میں پانی کی کمی، ریت کی چمک، گرم ہوا، پھٹے ہوئے ہونٹ، پیٹ میں اختنا ہوا مروڑ، یہ سب ہماری جدوجہد کے شمات تھے۔ ہم ریتلے پہاڑی ٹیلوں میں سے نکل آئے تھے۔ اس کامیابی پر ہم بجا طور پر نازاں تھے۔

رجڑ نے کہا کہ چینیوں کا کہنا ہے کہ وقت آدمی کو ہیر و بہاتا ہے۔ ہمارا دن بھی آنے والا ہے۔ مزار تاغ کا سلسلہ کوہ ہماری نظروں میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے، ہم بظاہرنا قابل عبور پہاڑوں کے درمیان سے راستہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمارے لیے یہ برطانوی ہم کی فتح اور کامیابی تھی۔ ہم

نے ہر روز معینہ منزل تک رسائی کے لیے آن تھک جدوجہد کی تھی۔ ہم کبھی اونٹوں کی قطار کے آگے چل رہے ہوتے تھے اور کبھی پیچھے، ہم سارے بانوں کی ہمت بندھاتے اور انہیں اونٹوں سے کام لیتے رہنے پر آمادہ کرتے۔ یہ بے حد تھکا دینے والا کام تھا۔ ریپورٹ، رچڑ اور میں نے سخت پیچش اور کمزوری کے باوجود یہ کام جاری رکھا۔ ہم نے اپنے آپ کو ریٹنے پہاڑوں کے حوالے کیے رکھا۔ ہمارے برعکس چینی صبح کو دیر سے اٹھتے، بڑی مشکل سے سمجھ پاتے کہ انہیں دن میں اپنے حصے کا کون سا کام کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ قافلے پر پیچھے چلتے، لاوزہاؤ کا معاملہ الگ تھا۔ ہم نے اس سے دوستی کر لی تھی۔ صحراء کے بارے میں اس کی معلومات قبل قدر تھیں، چینی ٹیم میں سے وہ سب سے پہلے جا گئی، ناشتاہ تیار کرنے اور رات کا کھانا تیار کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہتا۔ گیو جن واٹی بھی کام کا ج میں سرگرمی دکھانا چاہتا تھا لیکن ایک تو اس کی صحت اچھی نہیں تھی، دوسرے اس کا وزن زیادہ تھا۔ رچڑ، برطانوی اور چینی ٹیموں کے درمیان مفاہمت کرانے اور برقرار رکھنے کے لیے ہمہ وقت کوشش رہتا۔ وہ لوگوں کے کریکٹر کے بارے میں بڑی معلومات رکھتا تھا۔ وہ دونوں ٹیموں میں اختلافات شروع ہوتے ہی انہیں ختم کرانے کی کوشش شروع کر دیتا۔ اس کا احساس ذمہ داری، ہماری اپنی ٹیم کے لیے بھی مفید ثابت ہوتا۔ وہ میرا مشیر بھی تھا اور حوصلہ افزائی کرنے والا بھی۔ واپسی پر اس نے ریپورٹ، کیتھ اور کیرولین کی ترجمانی کرنا شروع کر دی، جو حالات کا تجزیہ کرنے اور ان سے مناسب انداز میں منٹنے میں اس جیسے موثر نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ جب وہ مزار تاج سے واپس جائے گا تو مجھے اس کی کمی محسوس ہو گی۔ وہ ہم میں شامل ہوا تو اسے اپنے بُنک کی شرط کے مطابق ایک مینے کے بعد واپس جانا تھا اور شنگھائی میں اپنے بُنک میں بُرنس شارخ کے لیے دفتر قائم کرنا تھا۔ میری فوجی طرز کی قائدانہ صلاحیت اور رچڑ کی سفارت کاری، ذہانت اور ہوشیاری نے مل کر ایک موثر قوت بنا دی تھی، چینیوں کا انداز فکر و عمل، دنیا داری کا تھا۔ اسی لیے ہمیں ان پروفیشنل حاصل تھی۔ ہم کی رہبری برطانوی ارکان کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں کسی قسم کے چیلنج کا سامنا نہیں تھا۔ چینی ہمارے نقوش پا پر چل رہے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا تعاویں مفید ثابت ہوا تھا۔ ہم نے ہم کے ارکان کی ترتیب میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس روز ہمیں مزارتان غ پہاڑی سلسلہ نظر آیا، اونٹوں کے لیے پانی نہیں ملا۔ ہمارے اپنے پاس صرف 900 لتر پانی رہ گیا تھا۔ ہم ابتدائی منزل سے، جہاں پانی میسر آنے کا امکان تھا، کوئی 100 میل دور تھے۔ اس کے باوجود چینیوں اور سارے بانوں کا حوصلہ پہلے سے کہیں زیادہ بلند تھا۔

پورے چاند کی رات، ریت کے ٹیکلے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اور گیوجن والی نے بیٹھ کر، اب تک کی پیش رفت کا جائزہ لیا۔ صحرائے جس انداز سے عبور کیا جا رہا تھا، اس پر بھی ناقدانہ نظر کی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ہر صبح کو چینیوں اور سارے بانوں کو سخت سوت کہنا چھوڑ دوں۔ میرے لیے انہیں منظم کرنے، سامان باندھنے اور اونٹوں پر لادنے میں مستعدی برتنے پر آمادہ کرنے کے لیے سخت کلامی کرنا مجبوری بن گئی تھی۔ اگلے دن کے سفر کی تیاری کے لیے میں سب کو چار گھنٹے پیشتر جگا دیتا تھا۔ برطانوی ارکان کچھ سانا گواری کا اظہار کرتے۔ وہ دس ساڑھے دس بجے ہی تیار ہو جاتے۔

میں گیو کو پسند کرنے لگا تھا، اس کی جسمانی صلاحیت اور خود اعتمادی میں تدریجی اضافہ ہو گیا تھا۔ چینی ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے بھی اس کی صلاحیتوں میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے ہم مغربیوں کی پسند ناپسند کا ادراک کر لیا تھا۔ غرض وہ ہر لحاظ سے بہت اچھا معاون ثابت ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ حقیقت میں آدھا کورین ہے۔ اس کی ابتدائی پروپریٹی میں ہوئی تھی۔ شفافی انقلاب کے دوران میں اس کے والدین کو سنکیا گنگ نہیں بھیج دیا گیا۔ اس کا باپ چینی فوج میں سپاہی تھا اور اس نے کوریا کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کا باپ بھی اس جنگ میں شامل رہا، اس نے بیقیناً اس پر گولا باری کی ہوگی۔ میں نے گیو سے مذاق میں کہا کہ تمہارے اور میرے باپ ایک ہی جنگ میں شریک رہے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے ایک دوسرے پر فائز بھی کیا ہو۔ اگر وہ بھی باہم ملے ہوں تو انہوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ چالیس برس بعد ان کے بیٹے تین مہینوں کے لیے ایک ساتھ صحرائے جو عبور کرنے کی مہم میں شامل ہوں گے اور اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے رہے ہوں۔ جنگ کے بعد اس کا باپ شناہی کوریا میں بھی رہا اور مانچوریا آنے سے پہلے

اس نے ایک کسان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ گیو جب سال سال کا ہوا تو اس کے پورے خاندان کو اپنی بیوی بھیج دیا گیا۔ اس کا باپ جاپانی زبان بڑی روائی سے بولتا تھا۔ چنپی حکام کے نزدیک اس کا یہ وصف منقی نوعیت کا تھا۔ اسی وجہ سے اسے کسی دور افتادہ مقام پر ایک کھلی جیل میں بھیج دیا گیا۔ گیو نے دس برس تک اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں سننا۔ خاندان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ ثقافتی انقلاب کے دوران میں گیو ایک فارم پر کام کرتا رہا تھا۔ اس نے ٹریکٹر چلاتا سیکھ لیا تھا۔ یہ اس کے سکول جانے کے دن تھے لیکن بد قسمتی سے وہ نہیں جاسکا۔ اس کا اسے ہمیشہ افسوس رہا۔

اسی دوران میں مجھے رفع حاجت کے لیے ایک ٹیلہ کے پیچھے جانا پڑا۔ میرے پہیٹ میں مردوڑاٹھ رہا تھا۔ جس نے مجھے شدید تکلیف میں بٹلا کر دیا تھا۔ پیش ہوئے چھ دن ہو گئے تھے۔ میں اس عرصے میں نقاہت کا شکار ہو گیا تھا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلے پر رچڑو درد کے مارے کراہ رہا تھا۔ وہ بولا، ہم پر آج کل جو گزر رہی ہے، ایک دن ہم اسے یاد کریں گے اور مسکرائیں گے۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو لیت کر، تاروں کو دیکھنے لگے۔ ہم اپنے مستقبل اور اپنے گھروالوں کے بارے میں باقی میں باقی رہے۔ صحرائے سانے کو کسی اونٹ کی گھنٹی کی آواز چند لمحوں کے لیے توڑ دیتی۔ اونٹ جھاڑی کی تلاش میں نکل جایا کرتے تھے۔

دوسرے دن ہم یہی تاغ کے مغربی کنارے تک پہنچ گئے۔ یہاں ٹیلے ہموار تھے، انہیں نسبتاً آسانی سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ شمال مشرق کی جانب مزار تاغ تھا۔ اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں مختلف رنگوں کی تھیں۔ کوئی سرخ، کوئی بھوری اور کوئی پیلی۔ ریت میں سفید چوٹیوں کا الگ سلسلہ تھا۔ ان کے بعض بلکہ ہم نے اپنی جیبوں میں رکھ لیکن وہ اتنے وزنی ہو گئے کہ ہمیں بالآخر انہیں پھینکنا پڑا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم یہی تاغ کی جزوی طرف کے متوازی چل رہے ہیں، ہم نے سرخ، پیلے اور سفید پہاڑوں پر چڑھنا شروع کیا۔ جنوب کی طرف دیکھا تو ہموار زمین نظر آئی۔ ہم اس منظر میں اس درجہ کھو گئے تھے کہ بھول گئے کہ اونٹ تین دن سے پیاسے ہیں۔ رچڑو کی بیماری بھی یاد نہ رہی۔ ہم نے لاکھ کہا کہ وہ اونٹ پر سوار ہو جائے لیکن وہ نہیں ماتا،

وہ پانی کی بیتل اٹھائے چلتا رہا، وہ شاید ہمیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اسے اونٹ پر بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ شام ہونے والی تھی۔ سورج ہمارے عقب میں چمک رہا تھا۔ ہمارے سامنے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم عمودی چٹان پر جا پہنچے۔ پہاڑ پیچے رہ گئے تھے اور سامنے ایک ہموار وادی تھی، جس کے گرد ٹیلوں نے دائرہ سا بنا رکھا تھا۔ یہ ٹیلے نئے نئے بنے تھے۔ ہم 300 فٹ کی بلندی سے اتر رہے تھے۔ نیچے پہنچے تو ہمارے جسم پر گرم ریت کی تہہ بھی ہوئی تھی۔ ہم سخت تھک گئے تھے۔ میرا منہ اتنا خشک ہو گیا تھا جیسے وہ اندر سے گستے کا بنا ہوا ہے۔

رجڑ آخی چٹان پر کھڑا رہ گیا۔ وہ ہلنے جلنے کی سکت سے محروم ہو گیا تھا۔ ہم اسے دیکھتے رہے لیکن کسی میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ واپس جا کر اسے سہارا دینا اور نیچے لاتا۔ اسے بھی اس کی توقع نہیں تھی، لگتا تھا کہ وہ طاقت جمع کرنے کی کوشش میں ہے تاکہ کیمپ تک پہنچ سکے۔ ہماری پہلی ترجیح پانی تلاش کرنے کی تھی۔ ہم میں سے بہت سوں نے زمین کھو دنا شروع کر دی۔ چھفت کے بعد ریت گیلی گی، ہم نے باقاعدہ کھدائی مکمل کرنے کی ذمہ داری سار بانوں کو سونپ دی۔ اس وقت تک اندر ہمراہ ہو گیا تھا۔ اتنے میں رجڑ بھی آپہنچا، ہم نے اسے فوراً سلپنگ بیگ میں لٹا دیا اور کیرولین نے اسے اینٹی باسیوں کی خوراک دی۔ ہم نے اسے آرام کرنے کے لیے بہت کہا لیکن وہ نہیں مانا، وہ لیٹا ہوا تھا، اس کا چہرہ مر جما گیا تھا۔ اس کے کالے بالوں کا رنگ ریت پڑنے کے سبب سے سفید ہو گیا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کی زندہ دلی قائم تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس کا آخر کا وقت قریب آپہنچا ہے، اس لیے اس کی مدد فین کا بندوبست کیا جائے۔ مجھے اس کی حالت کے بارے میں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگلا دن اس کے لیے بہت صبر آزماء ہو گا۔ ہم سب کی توجہ رجڑ پر تھی۔ سار بانوں کو بھول ہی گئے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اندر ہمراہ چھانے کے بہت بعد وہ چٹانوں پر سے واپس آئے، کہاںیں ان کے کندھوں پر دھری تھیں وہ ایک دائرے میں بیٹھ گئے اور آگ تاپنے لگے۔ میں نے گیو سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے، اس نے جواب دیا، سونا تلاش کرنے گئے تھے۔ سار بانوں کا خیال تھا کہ ان پہاڑوں میں سونا ہے، ان تک یہی روایت پہنچی ہے۔ ان کے خیال

میں آپ سونے اور گم شدہ شہروں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے بھی اس خیال سے آپ کا ساتھ دیا ہے اور اتنا کٹھن سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ میں سارے بانوں کے پاس گیا اور پوچھا کہ پانی کیسا تکلا؟ ان کا جواب تھا کہ بہت اچھا پانی ملا ہے۔ انہوں نے جو رنگ دار پھر جمع کیے تھے، سامنے بکھیر دیے۔ عبدالرشید نے اونٹ کی پرانی پالان دکھائی جو اسے وہاں سے ملی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کوئی قدیم بستی تھی یا پھر مزارتاگ کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ کوئی تجارتی راستہ گزرتا تھا۔ میں جانے لگا تو عیسیٰ پولتانا نے بتایا کہ پانی کی تلاش میں انہوں نے جو کنوں اکھودا ہے، اس سے پانی تولی گیا ہے لیکن وہ نہیں کیا ہے، اونٹ اسے پی کر بیمار پڑ جائیں گے یا مر جائیں گے۔ کل تک ہم پانی تلاش نہ کر سکے تو آدھے اونٹ تو پیاس کی شدت کے باعث مر جائیں گے۔ رچڈ پچھل کے باعث بہت نحیف ہو گیا تھا۔ کیا وہ زندہ بچے گا؟ پچھنہیں کہا جا سکتا تھا۔ صورت حال خاصی خراب تھی، آدھے سارے بان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، سونے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

میں روپرٹ کی طرف گیا جس نے انگلستان سے رابطے کے لیے مرکز قائم کیا تھا۔ ہم دونوں اندر ہیرے میں کھڑے، سیلیاٹ سے ٹیلی فون آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں جزیرہ چلنے کی آواز نے فضا میں تحرک پیدا کیے رکھا۔ ٹیلی فون کی ٹھنٹی بجی تو حیرت سے اچھل پڑے اور اس کا لے باکس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ روپرٹ نے رسیور اٹھایا، وققے دقتے سے ہیلو، ہیلو کہا اور پھر تکلامکان سے بول رہے ہیں، کی آواز بلند کی۔ ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔ صحراء میں یہی تو ایک ٹیلی فون تھا جو روپرٹ نے بڑی محنت سے قائم کیا تھا۔ دوسری طرف سے یہاں کی آواز آئی، وہ کہہ رہی تھی کہ ”سنڈے ٹائمز“ والوں کا کہنا ہے کہ وہ ہم کے بارے میں تفصیلی رپورٹ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں زیادہ دلچسپی اس سے ہے کہ ہم کہاں تک پہنچی ہے۔ یہاں اپنے گھر کے ٹیلی فون سے بات کر رہی تھی۔ وہ بچوں کو لے کر سکول جانے کے لیے نکلنے والی تھی، اس کی آواز میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ وہ اس طرح بات کر رہی تھی کہ ہم صحراء سے نہیں بلکہ شہر ہی کے کسی کونے سے بات کر رہے ہیں۔ ہماری

گفت گو منظر رہی، میں اسے اپنی صورت حال کی نگینی کا احساس نہیں دلا سکا۔ ہمیں بس ایک ہی فکر تھی کہ اونٹوں کے لیے پانی مہیا ہو جائے، لیکن کہاں سے؟ درجہ حرارت 115 فارن ہائیٹ تک جا پہنچا تھا۔ ہوا بند تھی، تسلیمان کی کوئی صورت نہ تھی۔ سارباں جھلانے لگے تھے۔ وہ اپنا غصہ اونٹوں پر نکلتے، انہیں بے وجہ مارتے، اگر رستا ٹوٹ جاتا تو وہ اونٹوں کو ذمہ دار سمجھ کر مارنے لگتے۔ کوئی اونٹ سُست رو ہو جاتا تو سارا غصہ اس پر نکلتے۔ میں اور ریوپرٹ سب سے آگے چل رہے تھے۔ شدید گرمی کا اثر انسانوں اور جانوروں پر یکساں تھا۔ میرا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ اونٹوں کے کوہاں سکڑ گئے تھے۔ یہ پانی اور خوراک کی کمی کا نتیجہ تھا۔ اونٹوں میں طاقت کی کمی کا اظہار آن کی سُست رفتاری اور لڑکھڑانے سے ہوتا تھا۔ ساربانوں کی گیث کی جگہ، اونٹوں کی ڈولی نکالنے اور زور زور سے ڈکارنے نے لے لی تھی۔ قطار کے آخری آٹھ اونٹوں کی حالت میرے لیے پریشان کن تھی۔ صح ساربانوں نے ان پر سب سے بھاری سامان لادا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر چلنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ ان میں سے ایک انداہا ہو گیا تھا۔ اس سب سے وہ قدم قدم پر رکنے اور گرنے لگا، کمزور اونٹوں پر زیادہ بوجھ لادنے کا مقصد یہ تھا کہ جب تک وہ کام کر سکتے ہیں، کریں، یا پھر ہلاک ہو جائیں۔ جن اونٹوں کی صحت اور حالت اچھی تھی، انہیں بچا بچا کر رکھا جا رہا تھا تاکہ وہ ہم کو دور تک لے جاسکیں۔

اس روز رچڑاونٹ پر سوار رہا۔ جس کے باعث کی اس کی صحت اور تو انائی قدرے بہتر ہو گئی۔ سہ پہر کو گری تیز ہو گئی، میں دعا کرنے لگا کہ خدا ہوا چلا دے تاکہ کچھ تو سکون ملے اور دم میں دم آئے۔ ہم تھکے ہارے چلتے گئے اور اس حالت میں بارہ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ کارروان دو میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اگلے حصے اور پچھلے حصے میں دو میل کا فرق تھا۔ سہ پہر کو ہمیں پہاڑ کی ایک چوٹی اس طرح آگے کو نکلی ہوئی نظر آئی جیسے کسی بڑے جنگلی جہاز میں نظر آیا کرتی ہے۔

امیر، جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، پکارا، لوئیں تاغ۔ میں جیران تھا کہ اس نے کس طرح پہاڑ کے اس حصے کو نام دے لیا ہے۔ اس نے ”لوئیں تاغ“ کا نام دہرا�ا اور اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے منہ میری طرف کر لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں

خاموش رہنے کی بجائے کوئی پات کروں اور پہاڑ کی چٹی کو اس نے جو نام دیا ہے، اس کے بارے میں پوچھوں۔ مجھے مشرق و سطی کے سفر کے دوران میں ملنے والے بد و یاد آئے، جو جدید دور کے نئتوں سے نابلد، اپنے اجداد کے سنتے سنائے قصوں کی بنا پر صحراء میں اپنے لیے صحیح راستہ تلاش کر لیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ریوپرٹ نے ایک جگہ تلاش کر لی، جہاں کچھ سبزہ تھا۔ بیہاں پانی ملنے کا امکان تھا۔ میں نے اسے کریم کے ساتھ آگے جانے اور آزمائش کنوں کھونے کے لیے کہا، اس نے کہا کہ میں ریڈ یویسی کو دوں اور کیا کہ بیہاں پانی ملنے کا قوی امکان ہے۔ اس نے کہا کہ میں ریڈ یویسی کو دوں اور اسے پتاوں کہ اسے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کریم کی آواز سنی تو اس کی خوشی کی انہنہاں رہتی۔ یہ ان کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ انہوں نے نئے دور کے مواصلاتی آئے کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ عیسیٰ نے مجھے بتایا کہ کریم کا کہنا ہے کہ بیہاں پانی مل سکتا ہے، باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، کنوں کھونا شروع کر دو۔

ہم باری باری کھدائی کرتے رہے۔ اس امید کے ساتھ کہ اونٹوں کے لیے وافر مقدار میں پانی مل جائے گا۔ اونٹ سیر ہو کر پانی پیش گے۔ ریت میں رطوبت بڑھی اور اس کی خوبصورتوں تک پہنچی تو وہ دوڑے آئے اور اس جگہ کے گرد گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ امیر نے گلی ریت مٹھی میں لے کر سوکھی اور چکھی، ہم دعا کر رہے تھے کہ خدا کرے، پانی میٹھا ہو۔ نمکین اور گڑوانہ ہو، تاکہ اونٹ پی سکیں۔ اگر نمکین نکل آیا تو میں اپنا سارا سامان باندھ کر مشرق کا رخ کروں گا کہ شاید وہاں پانی مل جائے۔ امیر پکارا، ”مل گیا، مل گیا“، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہم ایک نئی آزمائش سے ٹھیک گئے تھے۔ سارے بانوں نے اونٹوں کو کئے ہوئے ٹینوں میں پانی پلانا شروع کر دیا۔ میں نے برطانوی اور چینی ٹیم کے ارکان کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ وہ فاضل خوراک، غلہ اور آلات پھیٹک دیں، میرا اندمازہ تھا کہ ہمیں دس روز کی سپلانی درکار تھی۔ اتنے میں ہم مزارتاغ پہنچ جائیں گے۔ اونٹوں سے بوجھ کم کر کے ہی قافلہ کی رفاقت بڑھا سکتے ہیں۔

اس رات میں نے پورے چاند کی روشنی میں اپنی ڈائری لکھی۔ میں نے سوچا کہ میرے خاندان کے لوگ بھی پورا چاند دیکھ رہے ہوں گے اور میری بہ حفاظت

والپسی کی دعا کر رہے ہوں گے۔ تین ماہ بعد جب میں والپس گھر پہنچا تو میرے چار سالہ بیٹے جیک نے بتایا کہ ”میں پورا چاند دیکھنے کے لیے اپنی چارپائی باہر گھسیت لایا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آپ بھی صحراء میں چاند دیکھ رہے ہوں گے۔“ چاند بھی ایک دوسرے کے دلوں کا حال پہنچانے کا بڑا عجیب خاموش وسیلہ ہے۔

شام پرستی تو ہم آگ کے گرد بیٹھ کر باتیں کرتے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی باتیں، لطینی ساتھ، بُنیٰ ٹھھول کرتے اور خوب دھوم مچاتے۔ اس رات تو ہم اور بھی خوش تھے، دن میں ہم نے جی بھر کر پانی پیا تھا۔ مزارتانگ پہنچنے کے لیے ہمیں پینے اور کھانا پکانے کے لیے جتنا پانی چاہیے تھا وہ ہمارے پاس تھا۔ صرف دو مقامات پر پانی ملنے کی آس لے کر ہی روانہ ہوئے۔ رچڈ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس کی ہمت اور وقت برداشت ہم سب کے لیے لاائق تقلید تھی۔ یہ اسی کا مرحلہ تھا کہ شدید پچھش کی صورت میں بھی، وہ چالیس میل تک چلتا آ رہا تھا۔ اس عرصے میں اس کی زبان پر کوئی حرفاً شکایت نہیں آیا، نہ صحراء کی تختی، نہ گرمی کی شدت۔

میرا گھٹنا بدستور درد کر رہا تھا۔ دن میں درد اور سوچن دور کرنے کی دوا میں دو مرتبہ لینا پڑتیں۔ مجھے یقین تھا کہ جس حال میں بھی تھا، گھٹنا ساتھ دیتا رہے گا۔ ہمیں ابھی 620 میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس میں 2 ماہ لگ سکتے تھے۔ ایک آن جانے صحراء میں جو کلفتوں اور آزمائشوں کی آماج گاہ تھا، ہمیں منزل تک رسائی کے لیے سفر جاری رکھنا تھا۔

ڈائری لکھنے کے بعد میں اپنے سلپنگ بیک میں پیٹھ کے بل لیٹ کر آسان کی طرف دیکھنے لگا، ایک تاراٹونا اور روشنی کی لکیر باتے ہوئے ڈوب گیا۔ میری دعا تھی کہ ہکلا مکان صحراء کو عبور کرنے کی کوشش کامیاب ہو۔ ریت کے ٹیکے ہمارے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ ہم ان میں سے گزرتے آ رہے تھے۔ لیکن خطرے نہیں ٹلے تھے۔ ہم خطروں میں گھرے ہوئے، صحراء کے رازوں سے آشنا ہو رہے تھے۔ مہم کی کامیابی تک چند اونٹ اگر جان ہار دیں تو اس تکلیف کو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن کسی انسانی چان کا جانا، ناقابل تلافی صدمے کا موجب ہو گا۔ کوئی حادثہ اس کا سبب بنتا یا پانی کی قلت جان لیوا ثابت ہوتی۔ میری خواہش تھی کہ سبھی صحیح و سالم اپنی منزل

تک پہنچیں۔ ہماری ٹیم نے مربوط شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر فرد نے اپنی انفرادیت کو ٹیم کی اجتماعیت میں ضم کر دیا تھا۔ ہر ایک کو اجتماعی مفاد عزیز تھا۔ درپیش چیخ نے ہمیں جہاں بے بناء قوت سُکھی تھی، وہاں ہمیں ایک لڑی میں بھی پرو دیا تھا۔ ہمارے دو دشمن تھے۔ ایک صحراء، دوسرا وقت۔ ہم دونوں کے خلاف نبر آزماتھے۔ دونوں نے ہمارے چھوٹے سے قافلے کے خلاف اتحاد کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک اور تاراٹوٹا دیکھا اور دوسری تمنا کی، اپنی اور خاندان کے افراد کی صحت اور خوش حالی کی۔ سونے سے پہلے مجھ پر عدم تحفظ کا احساس حاوی ہو گیا۔ میں نے اپنے باپ کے بارے میں سوچا، میں نے ان کی جو روشنی جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کی نرمی اور گرمی محسوس کی اور لگا کہ وہ مجھے دیکھتے رہے ہیں۔ مجھے علم تھا کہ میرے عقائد، میرے لیے قوت کا منبع ہیں۔ میں نے پہلو بدلا اور سو گیا۔ کل کیا پیش آنے والا ہے، اس کے بارے میں سوچنا بند کر دیا تھا۔

اگلے چار روز میں ہم نے سانچھ میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس دوران میں بھی ہموار اور بھی رستے نیلوں میں سے گز رنا پڑا۔ ہم ان دونوں ہوا سے محروم رہے اور گری اور پیش سے جھلتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹ کر بیٹھ گئے۔ اور بدمزہ بسکٹ زہر مار کرنے لگے۔ ہموار زمین پر ہماری رفتار قدرے بہتر ہو گئی۔ لیکن قدم اٹھاتے ہوئے بڑی تکلیف ہوتی۔ پاؤں پر چھالے پڑنے تھے۔ دونوں کا بوجھ ہلکا ہو جانے کے سبب سے زخیوں کو دونوں پر سواری کرنے کی سہولت میسر آنے لگی۔ چند روز سے میرا گھنٹے کا درد پڑھ گیا تھا۔ میں نے اونٹ پر سواری کرنا شروع کر دی۔ میں اونٹ پر بیٹھے بیٹھے اوگھنے لگا اور پھر سو گیا۔ گدی کے ہلانے کے باعث میں جاگ گیا۔ روپرٹ اور کیم ولین سے کہا کہ وہ بھی اونٹ پر سوار ہو جائیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ تکلامکان صحراء کو پایا دادھل کر عبور کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے احترام اور تو صیف کا جذبہ تھا۔ عیسیٰ اپنے پسندیدہ اونٹ پر سوار تھا۔ چوڑا چکلا پاٹھ، سیدھی کمر، لمبی سفید داڑھی اور نیلی جیکٹ جو چھاتی کے قریب رسی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ بڑا دل کشا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اونٹ کو بھگانا شروع کر دیا۔ اس کا اونٹ تیز تیز قدموں سے میدان کے

واحد پالپ درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اونٹ درخت کی جگہ ہوئی ٹھنڈیوں سے الجھتا جا رہا تھا۔ ہم ڈرے کے عیسیٰ ابھی گرتا ہے اور ہڈی پسلی تزویا لیتا ہے، لیکن وہ صاف نیچے گیا۔ اس پر درخت کے پتے پھیلے ہوئے تھے اور کچھ نہیں ہوا تھا۔

رمٹلے پہاڑوں میں سے گزرتے پانچ دن ہو گئے تھے۔ روپرٹ اوچے ٹیلے پر چڑھ کر مناسب راستہ منتخب کر رہا تھا۔ اچانک اس کی آواز آئی، ”سینزہ، سینزہ،“ ہم نے اس کے اشارے کے مطابق رخ بدلا اور گھری ریت میں مشکل سے قدم اٹھاتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے آگے درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے پیچھے ریت کے پہاڑ تھے اور آگے سرینزہ درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ ہم اس طرح کا دل فریب مظفر دیکھنے کے لیے ترس گئے تھے۔ ”الحمد للہ،“ ہم پکارا تھے۔ سارے باؤنوں نے گیت گانا شروع کر دیے تھے۔ ہمارے لیے یہ وادی، بہشت سے کم نہیں تھی۔ جس میں دودھ اور شہد کی ندیاں بننے کی بشارت دی گئی تھی۔ ہم نے وادی میں اترتے اور سینزہ و گیاہ میں سے گزرتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے ہم کسی گھنے جنگل میں سے گزر رہے ہوں۔ میں نے چاہا کہ درخت باقی کرنے لگیں اور پتا کیں کہ اتنے طویل عرصے میں ان پر کیا بیٹھی آئی۔

4۔ اکتوبر کو میں نے باری کی آواز سنی، لگتا تھا جیسے وہ دنیا کے دوسرے سرے سے بول رہا ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ مزارتانگ کے لیے روانہ ہو رہا ہے، دو روز میں وہاں پہنچ جائے گا۔ امدادی ٹیم سے ملنے کی خوشی سے ہم سبھی سرشار ہو گئے۔ تمام تر مشکلات کے باوجود صورت حالات میں بہتری کے آثار نمایاں تھے۔ پانچ چھ روز کا سفر باقی تھا۔ ہمارے پاس 400 لٹر پانی موجود تھا۔ یعنی 4 لٹر پانی فی کس، اگر کوئی حادث پیش نہ آیا تو یہ پانی باقی کے سفر کے لیے کافی تھا۔ پانی کا ضیاء، ہماری مستقل سردردی کا موجب تھا۔ اگر ہم پانی کو بخارات بن کر اڑ جانے سے روکنے کے لیے کنٹینریوں پر گھاس پھوس باندھ سکتے تو اچھا ہوتا، لیکن خواہش کے باوجود ہم ایسا نہیں کر سکے۔

میں نے 5۔ اکتوبر کی ڈائری میں لکھا:
”صحیح ہوتی ہے اور گزر جاتی ہے، اسے دیکھنے اور محسوس کرنے کا وقت نہیں

ملتا۔ ہم سامان اٹھا کرنے، لادنے اور باندھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ میں نے شمال کی طرف دیکھا، زردا سماں کے پس منظر میں آسمان پر وینس کو چکلتے اور زمین پر ہریائی کو ہلکوڑے لیتے دیکھا۔ درختوں کے قریب سارے بانوں نے آگ جلانی ہوئی تھی۔ وہ اٹھے اور نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے چہروں پر ابھی تک ریت موجود تھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو الاؤ کے گرد بیٹھ گئے اور اپنے پاؤں آگ کے سامنے رکھ کر گرم کرنے لگے۔ عیسیٰ پوتا ہماری طرف آیا تو ہم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس ہو گیا، ہماری آگ بجھ گئی۔ مزارتانگ ہمارے باہمیں جانب تھا۔ روپرٹ کے ساتھ دو گھنٹے تک چلے۔ ریت پر چھوٹے چھوٹے، ہر طرح کے رنگوں والے گول، چینے اور نوک دار پھر پھیلے ہوئے تھے۔ رات کو گوارا ہوا چلتی رہی۔ ہم نے اٹھا رہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ مزارتانگ تک پہنچنے میں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔ جس راستے سے ہم نے صحراء بکریا، اس سے کبھی کوئی نہیں گزر۔ رچڈ کی صحت بہتر ہے البتہ کمزوری باقی ہے۔ روپرٹ اور میں آپلوں اور زخموں کے باعث درد محسوس کر رہے ہیں لیکن عام طور پر ہماری حالت پہلے کی نسبت بہتر ہے۔ کیونکہ تھکا ہوا ہے، یہی تانگ پہنچ کر اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا، اب منزل آگئی، سفر تام ہوا۔ اگلے پانچ چھروز کے سفر کے لیے جس ارادے اور ہمت کی ضرورت تھی، وہ اس نے چھوڑ دیا۔ اس کے پاؤں بری طرح رُخی ہیں۔ اس نے تین ہرن دیکھے، جو وادی میں موجود سبزے پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

دو دن بعد ریت کا طوفان اٹھا اور ہمیں صحراء میں بیتے پر خطرنوں کی یاد دلا گیا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ یہ طوفان اتنا شدید ہو گا، میں نے ہر ایک سے کہا کہ وہ اونٹوں کے پاس رہے، میں کارروان کے آگے اور روپرٹ اس کے پیچے تھا۔ ہم نے ریڈ یو پر ایک دوسرے سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ چینی کا لے طوفان سے سخت ڈرے ہوئے تھے، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جب اٹھتا ہے تو دن کو رات میں بدل دیتا ہے۔ گیو نے مجھے بتایا کہ موسم ایک لمحے میں بدل سکتا ہے اور ہم کا لے طوفان کی زد میں آنے کے سبب سے دھصوں میں منقسم اور ناکام ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بہار سے پہلے اور گرمائیں اس طرح کے طوفان اٹھا کرتے

بیں، لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ طوفانی ہوا، بگولے کی شکل میں چلتی، بگولے ریتلے ٹیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور رقص کرتے آسمان کی طرف اٹھتے چلے جاتے۔ فضاریت اور غبار سے اس طرح بھر گئی تھی کہ قریب ترین ٹیلے بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہم بس یہی کر سکتے تھے کہ سبھی لوگ اور جانور ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اگر ان میں سے کوئی الگ ہو گا تو اس طوفان میں اس کی آواز بھی نہیں سنائی دے گی۔ طوفان کی بھیانک آواز نے باقی سب آوازوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ قافلے سے پھر جانے والے ہمیشہ کے لیے ہو جاتے ہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ تکلامکان کے ریتلے طوفان کی دہشت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ ہم زندہ بچ تو یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ ہم نے صحرائی ہرختی جھیلی اور ہر مصیبت کا مقابلہ کیا۔ جب طوفانی بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور افق غبار کے سب سے نظروں سے اوچھل ہو گیا تو میں جی ہی میں ڈرنے لگا کہ میں نے گیو کو جو یقین دہانیاں کرائی تھیں، پانی کے بلبلے کی طرح ہوا میں تخلیل نہ ہو جائیں۔

دوپھر تک گھپ اندر ہیرا چھایا رہا، اس کے بعد وقوف کے ساتھ ملگھی سی روشنی دکھائی دے جاتی۔ کئی بار ریت آمیز ہوا کے اتنے شدید تپھیرے لگے کہ ہمارا دم گھٹنے کا جب جھکڑ زور باندھتا تو ہم گھٹنوں کے بل پیٹھ کر منہ زمین پر رکھ دیتے یا اونٹ کی محفوظ طرف کے ساتھ لگا دیتے۔ طوفان کی شدت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اونٹ بھی اپنی پیٹھ ہوا کی طرف موڑ دیتے اور گردن کو زمین پر لگا دیتے۔

دوسری صبح فضاقدرے صاف تھی، بیمار اور کمزور ساتھیوں کو اونٹوں پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ ایک رات پہلے سار بانوں نے آدھا کنوال کھودا اور پھر سونے کی تلاش میں نکل گئے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں مزارتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ان کا یہ روایہ اچھا نہیں لگا۔ عیسیٰ پوتا نے بھی یقین دلایا کہ اونٹوں کو رات پانی پلایا جائے گا۔ اس پر ان سب کو چلتے جانے کی سزا دی گئی۔ انہوں نے بہترے عذر پیش کیے۔ عیسیٰ نے مجھے کہا کہ ”آپ نے سار بانوں کو نقشہ دکھایا تھا“، ”ہاں، دکھایا تھا، لیکن صرف راستہ طے کرنے کے لیے۔“

”پھر آپ نقش لے کر میلے کے پیچے چلے گئے تھے؟“

”ہاں۔“

”ہم نے سوچا کہ آپ سونے کے ذخیر کی نشان دہی کریں گے۔“

”پھر؟“

”ہم اپنی کدالیں لے کر چلے گئے جب واپس آئے تو اندر ہرا ہو چکا تھا۔
اب ایسے میں پانی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔“

اس نے اپنی آنکھیں اونٹوں پر سے نہیں ہٹائیں، جنہیں لادنے کے لیے بٹھایا گیا تھا۔ میں جب عیسیٰ پولتا کو خست سُست کہہ رہا تھا، سارباں مجھے غصے سے دیکھ رہے تھے۔ بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اونٹوں نے پانی نہیں پیا تھا۔ اب اس پر مزید بات کیا ہو سکتی تھی۔ مزار تاغ تک پہنچنے میں دو دن لگ سکتے تھے۔ اس لیے خنگی بے سبب نہ تھی۔ میں سارباںوں سمیت ان کے رہنماء عیسیٰ کو بتانا چاہتا تھا کہ انہوں نے کوتاہی کی ہے۔ میں نے کہا کہ اونٹوں کو دو کنسر پانی پلایا جائے۔ آج کوئی بھی اوٹ پرسواری نہیں کرے گا۔ اونٹوں کو دو دن پانی کے بغیر بہت سا بوجھ اٹھا کے چلتا ہے۔

شمال مشرقی ہوا چلنے لگی تھی، اس سے ریت اور غبار تو ضرور پھیلا لیکن گرمی کی شدت کم ہو گئی۔ ایک ہلکے سویٹر سے بھی کام چل سکتا تھا۔ 200 گز تک پہ مشکل نظر کام کرتی تھی، اس لیے ہم انہوں کی طرح چلنے لگے۔ صحرائیں ریت کے بیگلوں اور آسان پر گھرے کالے بادلوں کا رقص جاری تھا۔ ہمارے منہ، ناک، کان ریت سے بھر گئے تھے۔ کڑے اور جسم بھی ریت سے اٹے ہوئے تھے۔ ہم نے منہ اور آنکھیں سختی سے بند کر لیں اور ہوا کے خلاف زور لگا کر چلتے گئے۔ مجھے تو قع نہیں تھی کہ سفر کے آخر میں ایسے طوفانی جھکڑ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دو گھنٹے چلنے کے بعد ہی امدادی ٹیم نے ریڈ یو پر رابطہ قائم کیا۔ مجھے شک تھا کہ وہ کہیں مزار تاغ پہنچ چکے ہوں گے یا صحرائے ہموار ہے کو عبور کر کے ہماری طرف آ رہے ہوں گے۔ میں ان سے رابطہ نہ کر سکا۔ صحرائے اس ہے میں گاڑیاں لے جانا اور چلانا آسان تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، باری کی آواز آئی ”کیسے ہو؟“

”تم کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا
”تم فکر نہ کرو،“ میں نے محسوس کیا کہ وہ کہیں ہمارے آس پاس ہی ہے،
اچانک مل کر ہمیں جیران کرنا چاہتا ہے۔

ہم باہم ملنے کے قریب تھے، ہم کامیابی سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ 200 میل کا ڈشوار گزار فاصلہ طے کرنے کے لیے ہم نے بڑی زہرہ گداز مشکلات برداشت کیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اونٹوں کے لیے پانی کہاں دست یاب ہو گا۔ ہمیں کہاں سکون اور راحت نصیب ہو گی اور روز روز کی مسافت سے جان چھوٹے گی۔

طوفان پوری شدت سے جاری رہا، گاڑیوں کی آواز ہمیں سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک گھنٹا گزر، میں نے ایک چیخ سنی اور ہیڈ لائٹس ہماری طرف آتی دھکائی دیں۔ ”آ گئے، آ گئے،“ رچ ڈپکارا، اور ساتھ ہی ریڈ یو پر موسیقی کی آواز آنے لگی۔ مارکیٹ سے لے کر اب تک ہم نے موسیقی نہیں سنی تھی۔ ہم نے اونٹوں کو ٹھہرایا اور انتظار کرنے لگے، باری کی گاڑی پر یوئین جیک لہرا رہا تھا۔ ہارن زور زور سے بجھنے لگے اور ہر کوئی زور زور سے چیختے لگا۔ میرا گلاز ندھ گیا تھا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ یہ سب احساس تفاخر کا اثر تھا۔ گاڑیوں پر ہماری سر پرستی کرنے والوں کے نام اور ”جائٹ بولٹ چینی تکلامکان ڈیزیرٹ کراسنگ 1993“ لکھا تھا۔ سامان سے لدے اونٹ اور ساری بان بھی آپنے۔ ہم سب خوش اور شادمان تھے۔

ہم نے پیچھے مرڈ کر دیکھا تو ایک بسیط صحراء نظر آیا۔ اس نے ہمارا صبر آزمائے، ہماری ہمت کا امتحان لیئے اور ہماری ارادے کی چیلنج جاخنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

صحراء عبور کرنے والی پارٹی اور امدادی پارٹی کے ارکان ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ وہ ایک دوسرے کو سینے سے لگا کر بھینچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ ایک دوسرے کے بو سے لے رہے تھے۔ ان کے جذبات کی شدت کا کوئی اور اندازہ نہیں کر سکتا۔ امدادی پارٹی ہمارے لیے چائے، کافی اور چاکلیٹ لائی تھی۔ ساری بان اور چینی الگ بیٹھے تھے۔ وہ ہماری خوشی میں شرکیک نہیں تھے، ساری غلط فہمیاں، رنجشوں اور اختلافات کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا، اکٹھے

مصیبیں جھیلی تھیں۔ مہم کو برطانوی قرار دیے جانے نے انہیں مشترکہ مہم میں شرکت کے اعزاز سے محروم کر دیا تھا۔ ساربان کیا سوچ رہے تھے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ چنی یا برطانوی مہم کی کامیابی تھی، ساربان اپنے آپ کو الگ تھلک سمجھتے تھے، اسی لیے دور ہو بیٹھے تھے۔ ساربانوں کی تاریخ پر نظر کریں تو ان کی منکسر مزاجی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی تاریخ نے انہیں پیچھے اور قائم رکھنا سکھایا ہے۔ مہم میں شرکت کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو اشتراک کی سطح تک نہیں اٹھایا تھا۔

چینیوں کے رویے نے مجھے مایوس کیا۔ گیوان میں سب سے زیادہ وسیع انتہر تھا۔ اس نے بھی منہ سجایا تھا۔ انہوں نے ہمارے ملáp کو صرف ہمارا معاملہ سمجھا۔ اس لیے لائقی اختیار کیے رکھی۔ دیکھا جائے تو ان کی گاڑیاں، ہماری گاڑیوں کے مقابلہ میں کم تر درجے کی تھیں، چینی اصلاح صحراء میں مہم جوئی پر آمادہ ہی نہیں تھے، وہ زیادہ سے زیادہ امدادی کام کرنے پر استفا کرنے پر تیار تھے۔ ان کا اپنا قومی جھنڈا انہیں تھا، ان کی خبر لینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

تمام پہلوؤں کو طمظوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ اس مہم کی کامیابی کا سہرا برطانوی ٹیم کے سر بندھتا تھا۔ اس مہم کا آغاز انہوں نے ہی کیا اور اسے منطقی انجام تک پہنچانے میں مرکزی کردار بھی انہی کا تھا۔ ہماری گاڑیوں نے مزارتاغ کا رخ کیا تو گیو، کیولائی اور زہانگ ہوا پہلی بار کارروان سے نکل کر سب سے آگے چلنے لگے۔ وہ ریت کے طوفان کی زد میں آ گئے۔ ان کے پاس قطب نما یا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ لاوزہاؤ جو ہمارے درمیان رہا تھا، وہ ایک اونٹ کے سہارے نکل کر کھڑا ہوا۔ ساربانوں میں سے کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ قطعی طور پر واضح ہو گیا کہ مہم کی اصل طاقت برطانوی ارکان کے پاس تھی۔ وہی اول و آخر اس کے تنقیم اور محکم تھے۔ ساربانوں نے مہم کی کامیابی میں جو کردار ادا کیا تھا، اس کا اعتراض کیا جانا لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مہم کی کامیابی میں ثبت حصہ بٹایا تھا۔

ہم سب بہت تحکم گئے تھے۔ مزارتاغ تک کا دس میل کا فاصلہ، بیس میل کا لگتا تھا جسے ہمیں ہر حال میں طے کرنا تھا۔ قدم گھسیٹ کر چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ہمارے جسم مشینی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ایک قدم اٹھتا تو دوسرا قدم اس

کے آگے آ جاتا۔ عبوری اور امدادی ٹیموں کے ملأپ کا وقت گزر گیا تھا اور اس لمحے جو دلوں پیدا ہوا تھا وہ بھی باقی نہیں تھا۔ جسم اب سرتاپا درد تھے، عناصر قدرت نے ہمیں پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیا تھا۔ سامنے دوسو میل کا سفر تھا اور ہمارے جسم آرام کے لیے پکار کر رہے تھے۔ ہم ایک دن کیا، ایک گھنٹے کے لیے بھی نہ ستائے تھے اور نہ آرام کر سکے تھے۔ ہمیں ہر حال میں روزمرہ کی ذمہ داریاں پوری کرنا تھیں، ہم مزار تاغ پہنچ کر کمر کھولنے اور سیدھی کرنے کا سوچ رہے تھے۔ اس کے بعد ٹانگوں بستی کی طرف کوچ کرنے کا مرحلہ آتا۔ ابھی 580 میل کا فاصلہ طے کرنا باقی تھا۔



باب 8

مزارتانغ

یہ 1908 کے بہار کے دن تھے، جب ایول شین اپنے فاکس میریر کے ڈلیش کو لیے جنوبی شاہراہ ریشم کے ساتھ چلتا ہوا مغرب کی جانب کا شفر کی طرف مڑا۔ گزشتہ پانچ مہینوں کے دوران میں اس نے ہکلا مکان کی مشرقی سرحد کے پاس کی قدیم بودھ آثار دریافت کیے، اس کے پاس نوادر کا وسیع ذخیرہ تھا، جسے بیل گاؤں کے ذریعے وسطی ایشیا تک اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے جہاز تک لے جایا جانا تھا۔ یہ نوادر لندن برٹش میوزم میں پہنچتا تھا۔ اس نے ترکستان کے سرما کے مہینوں میں اسکی سفر کی صوبتیں برداشت کی ہیں۔ اس کو اگر کچھ مدد حاصل تھی تو مقامی لوگوں کی تھی، وہ چینی باغ میں برطانوی کوئل کے گھر پہنچنا چاہتا تھا، وہاں اس کی ڈاک آئی ہو گی، دوسرے اسے اپنے دوستوں سے گفتگو کا موقع مل سکتا تھا۔

شین جب ہوتن پہنچا تو اس نے مزارتانغ کے پراسرار پہاڑی صحرائی میں قدیم آثار کی موجودگی کے بارے میں سنا، قدیم آثار اور نوادر کی ملاش کی پیاس اس میں جاگ آئی، اس نے ہوتن دریا کے مغربی کنارے پر جلتے ہوئے شمال کا رخ اختیار کیا۔ اسے ایک مقامی کریم اخون کی مدد اور رہنمائی حاصل تھی۔ سات دن جلتے رہنے کے بعد وہ سنگلاخ اور سرخ چوٹیوں تک پہنچا، اس نے 200 فٹ بلند چوٹی پر سے وسیع ریتلے دریا کے وسط میں ایک چھوٹا سا قلعہ دیکھا جو شاید دریا کے ساتھ کے راستے کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس نے تین دن تک علاقے میں کھدائی کی اور کئی

چینی، تبت اور براہمی آثار دریافت کیے۔ قدیم رسم الخط کے نایاب نمونے بھی ملے۔ وہ رات کو اپنے خیسے میں بیٹھ کر پیرافن لیپ کی روشنی میں ان اشیا کو دیکھتا اور اندازے لگاتا رہتا۔ اس نے معلوم کیا کہ یہ نوادر آٹھویں اور نویں صدی کے دوران میں تبتی حملوں کے دور کے ہیں۔ شین نے ان نوادر کی تصاویر اور ضروری معلومات اپنی کتاب میں شائع کیں۔

8- اکتوبر کو جب ہم نے قلعہ دیکھا تو میں نے شین کی کتاب Ruins of Desert Cathay میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ سلاگایا اور آرام کرنے لگا، دو دن پہلے کی مشقت کے باعث میرا گھٹنا شدید درد کرنے لگا تھا۔ ہم نے چالیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ عام حالات میں یہ کوئی اتنا طویل فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن جب اتنا کچھ دیکھ لیا تھا اور ہم پر اتنا کچھ بیٹ گیا تھا، یہ فاصلہ بھی بہت طویل لگتا تھا۔ ہمارا کیپ، ایک چنان کی جنوب مغربی طرف تھا، اس سب سے صحیح کو سورج نظر نہیں آتا تھا۔ میرا دھیان شین اور ان تبتی شجاعوں کی طرف گیا، جنہوں نے شاید یہیں کہیں پڑا تو کیا ہو گا۔ چینی افسر، سپاہی، سوداگر، ساریان کئی صدیوں سے اس علاقے سے گزرتے رہے ہوں گے۔ انہوں نے ان چنانوں کو بھی ضرور دیکھا ہو گا۔

صحیح کا ناشتہ پہلے بالعموم رات کے بنچے کچھ کھانے پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس میں ریت اور جانے اور کیا کچھ ملا ہوتا۔ پھر انہوں پر سامان لادنے کا مرحلہ آتا۔ لیکن آج معمول سے ہٹ کر ہم نے دلیہ کھایا، کافی پی اور جی پھر کراثٹے کھائے۔ مارکیٹ کے بعد سے پہلا مناسب ناشتہ تھا، جس میں ہم نے چھری، فورک اور چیچ استعمال کیا۔ امدادی ٹیم نے ہمیں آرام پہنچانے کے لیے سب کچھ کیا۔ ہمارا سفر مشقتوں، شکوک و شبہات، خطروں اور احساس تہائی کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس میں بس ناشتے کے دوران میں ہی کچھ راحت نصیب ہوئی۔

میں نے بارنی کے ساتھ گاڑی کی اگلی نشت پر بیٹھ کر اگلے مرحلے کے سفر اور ہم کے آخری حصے میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں پیش بینی کرنا شروع کی۔ بارنی کا ایک اہم مسئلہ ہم کے ختم ہونے کے بعد گاڑیوں کو نکالنے کا تھا۔ چینی جان

MashaiBooks.com

تحامس کی اجازت اور ہاگ کا گنگ چینچنے کے لیے چین میں سے گزرنے کے لیے راہ داری کے لیے پریشان تھے۔ گاڑیاں اور سامان ہاگ کا گنگ سے ہی لندن بھیجا جاسکتا تھا۔ دوسرا مقابل راست خیبر گزرنے کا تھا۔ یہ دشوار گزار تھا، بر ف باری اور تو دے گرنے سے اکثر بند ہو جایا کرتا تھا۔ اگر وہ ہاگ کا گنگ نہ پہنچ سکے تو انہیں موسم بہار تک گاڑیاں نکلیاں گے میں چھوڑنا پڑیں گی۔

میں نے گاڑی میں سے باہر دیکھا، قریب ہی چینی فوج کا ایک ٹرک کھڑا تھا اور اس کے پیچے ایک بکری بندگی ہوئی تھی اور زور زور سے میماری تھی۔ اسے کیا علم کرو اور کتنا وقت زندہ رہے گی۔ اسے سارے بانوں کے کھانے کے لیے ذخیرہ ہونا تھا۔ میں بارفی کی تشویش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن مجھے بار بار صحراء کا خیال آتا، کبھی ان مشکلوں کا جواب بھی پیش آنا ہیں۔ گاڑیوں کو نکال لے جانے کی منصوبہ بندی کرنا سر دست بے معنی تھی۔

ٹرک کی دوسری جانب خیے نظر آئے جو چینی نیشنل ٹی وی کے عملے کے لیے گاڑے گئے تھے۔ اسے صحراء میں اترنے کی اختتامی تقریب کی فلم بنانے کے لیے بھجا گیا تھا۔ ہمارے صحراء میں اترنے کی تقریب کی فلم بھی اس عملے نے بنائی تھی۔ اس نے ہم میں سے ہر ایک کا فردا فردا انسڑو یو بھی لیا تھا اور ہم نے اپنے خاندانوں کے لیے پیغامات بھی ریکارڈ کرائے تھے۔ ہم رات کے گھپ اندر ہرے میں کمپ میں پہنچے تھے۔ جس پر چینی ٹی وی ٹیم سخت ناراض تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں دن کی روشنی میں وہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ ہم سفر کی سختیوں کے ستابے ہوئے جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہیے تھے۔ چینی عملے نے ہم میں شریک چینیوں کو ایک خیے میں لے جا کر انسڑو یو کرنا شروع کر دیا۔ میں نے سنا کہ وہ اپنی فتوحات پیان کرنے میں زمین آسمان کے قلا بے طا رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ انہوں نے کس بھادری سے مصیتیں جھیلیں اور ہر بار موت کے وار کو خالی جانے دیا۔ ان کے اس وعدے پر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ انہوں نے اپنے طور پر صحراء عبور کیا۔ وہ رات چاول کھاتے اور بیسر پیتے رہے۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ نئی سے نئی کہانی گھر تے رہے۔ میں حقائق پیان کرنا چاہتا تھا لیکن باہمی مفاہمت اور تعاون کے خیال سے سر دست خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا،

چینیوں پر ہوتا تو وہ کب کے مہم کو خیر باد کہہ کر واپس جا چکے ہوتے۔ ایک لاڈ زہاد تھا جس نے سچ بولا اور مہم کو جس طرح کے حالات پیش آئے ان کا بلا کم دکاست ذکر کر دیا۔ مجھے کیوں لائی پر بہت غصہ آیا جب اس نے اپنی مرح میں جھوٹ کا طوفان باندھنا شروع کر دیا۔ وہ مل جل کر کام کرنے کا بیرے سے الی ہی نہیں تھا۔ میری مہم کے پارے میں حاشیہ آرائی کرنے کا بھی اسے حق نہیں تھا، کیوں کہ مہم کے پارے میں سوچنے، فیصلہ کرنے، منصوبہ بنندی کرنے سے اور اسے شروع کرنے سے لے کر اختتام تک پہنچانے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ محض ساتھ چلتا رہا تھا اس کے سوا اس کا کوئی کردار اور کوئی حصہ نہیں تھا۔ دراصل میں مہم کے دوران میں مختلف امتحانوں اور آزمائشوں سے گزرتے گزرتے تحکم گیا تھا۔ کسی نوع کی غلط بیانی ناقابل برداشت تھی۔ میں حقوق کو ان کی اصل شکل میں ریکارڈ کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے صحراء میں جو کار نمایاں انجام دیا اس میں کسی قسم کا داخل مجھے منتظر نہیں تھا۔ ذرا لئے ابلاغ ہوں یا کوئی اور، ان کی حیثیت اجنبیوں کی سی تھی۔ وہ ہماری مہم کے اصل محرك کو مجھنے سے قاصر تھے۔ وہ نئے بوٹ اور بے داغ لباس پہنے، اپنے نرم اور گداز ہاتھوں سے مائیکرو فون لیے منہ کے سامنے رکھ کر، میرے خیالات اور میرے الفاظ پر قبضہ جمانے کی کوشش میں تھے۔ مجھے معمولی باتوں پر غصہ آنے لگا تھا۔

میں سخت بد دلی کے عالم میں خیے سے باہر نکل آیا اور سامان کے بے ترتیب انبار میں سے اپنی کٹ تلاش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک ہم چین میں ہیں، ہم پر وہ اپنا حق جنتے رہیں گے۔ ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تکلامکان کو عبور کرنے کی مہم میں بريطانیہ کا حصہ ضمیمنی انداز میں بیان کیا جاتا رہے گا۔ اس رات میں نے چینیوں کی زبان سے جو کچھ سننا اور انہوں نے حقوق کو جس طرح توڑ کر بیان کیا، میں اس پر جھنجھلا گیا تھا اور وہاں سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہتا تھا۔

بارنی نے مجھ سے پوچھا کیا تم نے وہ چیزیں دیکھی ہیں جو مارک نے دریافت کی ہیں۔ میں نے پوچھا کون سی؟ اس نے بتایا ایک لکھنؤی جو لکڑی سے بنائی گئی ہے، یہ غالباً بارہ سو سال پہلے کی ہے۔ اسے یہ لکھنؤی کہاں سے ملی ہے، قلعے سے چہاں شیئن نے 1908 میں کھدائی کی تھی اس نے آثار قدیمہ کی تہہ در تہہ کھدائی نہیں کی تھی۔

اس لیے وہ پوری صحت کے ساتھ حقائق بیان نہیں کر سکا۔ میں نے کہا کہ تم صحیح کہتے ہو لیکن ہم کھدائی کر کے جو آثار دریافت کریں گے، انہیں انگلینڈ نہیں لے جاسکیں گے اور نہ ہی برٹش میوزیم کو پیش کر پائیں گے۔ اس ساری محنت کا ہمیں کون معاوضہ دے گا؟ میں ذاتی طور پر مایوس تھا کہ وسط ایشیا میں ہماری مہم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی، جتنی اسے ملتی چاہیے تھی۔ جب ہم چین کے لیے روانہ ہوئے تھے تو برٹش میوزیم نے ہمارے منصوبوں سے، جو ہم ان کے لیے زیر عمل لانا چاہتے تھے، لاتفاقی اختیار کر لی تھی۔ اس اہم موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے تھا لیکن میوزیم نے یہ کہہ کر کہ یہ مختصر نو عیت کی مہم ہے جو ان کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں، اپنا دامن چھڑا لیا۔ ممکن ہے کہ چینی ایک روز شین کی دریافت شدہ اشیا کی واپسی کا دعویٰ کرنے لگیں۔ یہ جھگڑا چھڑ گیا تو جانے کہاں ختم ہو۔

میں کیتھ اور کیرولین کے ساتھ مزارتانہ کی پہاڑی پر چڑھا، سرخ ریت سے بنی یہ پہاڑی 500 فٹ بلند تھی۔ اس کے گرد ہموار میدان تھا جس پر گھوڑے کے نعلوں کی شکل کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ مشرق کی طرف درختوں اور جھونپڑیوں کی ایک قطار تھی، جس نے دریائے ہوتن اور پیش منظر میں حد فاصل قائم رکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ شین ڈھلوان کی طرف سے اس ٹیلے پر چڑھا ہو گا۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ وہ نوٹ بک میں اپنے مشاہدات لکھ رہا ہو گا۔ اس نے اپنے معاونوں کو کھدائی کرنے کے لیے کہا ہو گا۔ وہ یہ سوچ کر کتنا خوش ہوا ہو گا کہ وہ اس دور افتادہ قلعے میں آثار قدیمہ کی تلاش کے لیے کھدائی کرنے والا پہلا شخص ہے۔ وہ دنیا کو بتائے گا کہ تھی اور چینی سپاہیوں نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تھا اور کھانے کے برتن اور دوسرا سامان دیوار سے باہر کی جانب پھینک دیا تھا۔ یہ چیزیں، دور دراز کے عجائب گھروں کی زیست بیسیں گی۔ میں دریا کی طرف دپکھ رہا تھا جس میں نام کو بھی پانی نہیں آتا۔ ٹوٹے پھوٹے برتن تھے، چیتھڑا نما قالین سمجھی جو شاید کسی بزرگ کے بیٹھنے کے کام آتی ہو۔ مجھے ایک چپل، چڑے کے چند لکڑے اور ایک لکڑی جس پر کوئی زبان کھدی ہوئی تھی، ملیں۔ میں نے یہ چیزیں پلاسٹک کے بیگ میں ڈال لیں تاکہ مہم کے خاتمے کے بعد یہ تعین کیا جاسکے کہ اس علاقے پر کس کا قبضہ تھا۔ میں ان چیزوں کو گھر لے جا سکتا تھا یا اگر

مناسب سمجھا تو چینی حکام کو پیش کر سکتا تھا۔

بارنی دوسرے روز ۹-اکتوبر کو برش امدادی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ چینی اور سارے بان چاہتے تھے کہ ہم دون آرام کریں۔ لیکن بارنی ان اشیا کو بھی لے جانا چاہتا تھا جو اس نے ہوتا میں رکھ دی تھیں۔ وہ ایک اور قدیم مقام ڈنڈون یوپلک پر جانا چاہتا تھا۔ یہ شاہراہ ریشم کے قریب، ہوتا اور دریائے ندیور کے درمیان واقع تھا۔ وہاں سے وہ واپس شاہراہ ریشم پر آنے، اناج، پانی اور دوسری اشیا لے کر بالٹور کے قریب صحراء کو عبور کرنے والی پارنی کے دوبارہ آٹھے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دوسرے وہ چینی ٹیم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا، جس کی عادات اسے سخت ناپسند تھیں۔ بارنی کے ساتھ رچڑ بھی گیا۔ اس کا ہمیں افسوس ہوا۔ وہ ہمیں ہنساتا رہتا اور خوش رکھتا۔ ٹیم کے رہنمائی میں ناراضی پیدا ہوتی تو وہ بیچ پچاؤ کر دیتا۔ ہمیں میں اس کا حصہ واقعی بہت شان دار تھا۔ اس نے ہانگ کانگ میں ہم کے لیے جس طرح فنڈ جمع کیے اور جس سفارت کا رانہ ہوش مندی سے چینیوں سے معاملہ ہبھی کی، ریتلے پہاڑوں پر چڑھنے کے سلسلہ پر جس عزم و حوصلے کا مظاہرہ کیا، غرض اس کا کردار ہر طرح سے لائق تھیں تھا۔ اسے دوسروں کے نام رکھنے کا بھی ملکہ تھا۔ اس نے عیسیٰ پوتا کو شاہ مغلولیا، روسا کو فاجن، لاڈ زہاد کو کیلکولس کہنا شروع کیا۔ وہ جب یہ نام پکارتا تو ہم سب ہنسنے لگتے۔ کیا دوسروں کے بھی اس کے بارے میں وہی احساسات تھے جو میرے تھے؟ میں نے کسی سے نہیں پوچھا۔ ہر حال وہ ٹیم کا بہترین رکن تھا۔ اس کی جگہ مارک کیٹونے نی، جو صحراء میں جانے کے لیے بے تاب تھا۔ بارنی اور فرانس کا معاملہ یک جان دو قابل کا تھا۔ جان اور اینی میاں بیوی تھے۔ مارک کے فقرے بارنی کو طیش دلانے کا موجب بنتے۔ بارنی اپنے فوجی پس منظر کے حوالے سے توقع رکھتا تھا کہ ہر کوئی اس کا احترام کرے۔ میں نے مارک کی ٹیم میں شمولیت کا خیر مقدم کیا تھا، وہ شریف الطبع تھا۔ روپرٹ سے میرا کچھ اختلاف نہیں ہوا لیکن اس کے رویے کی بنا پر میں اس سے کھنچاؤ محسوس کرتا تھا۔ وہ ہم میں آخری وقت شامل ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہم کو چین لے جانے تک کتنا وقت صرف ہو چکا ہے اور ہمیں کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ صحراء عبور کرنے کا مرحلہ تو بعد میں آتا تھا۔

کیتھ بھی امدادی ٹیم کے ساتھ چلا گیا۔ وہ اونٹوں، ریت کے ٹیلوں کی تصویریں کھینچتا تھک گیا تھا۔ وہ نئے موضوعات کی تلاش سے تھا۔ وہ شاہراہ ریشم پر پہنچ کرفن سے متعلق اپنی حس لطیف کی تسلیکن کرنا چاہتا تھا۔ ہمارا سب سے غیر متوقع پر سوز وداع مزار تاغ سے ہوا۔ 76 سالہ مرد بزرگ عیسیٰ پوتا ہوشن میں ہسپتال اور پھر شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ مارکیٹ میں اپنے گھر روانہ ہوا، اس کے بھتیجے روسا کو اس کی خبر گیری اور تیارداری کے لیے بھیجا گیا۔ ہمارے پاس صرف چار ساربان رہ گئے۔ لوسین، کریم، عبدالرشید اور امیر۔ جس روز امدادی ٹیم مزار تاغ کے مغرب میں ہم سے ملی تھی، اس دن عیسیٰ پوتا اونٹ سے گر گیا۔ اس کا اونٹ بدک گیا تھا اور عیسیٰ سخت زمین پر گر پڑا۔ وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں اس کی جان پر نہ بن جائے۔ خوش قسمتی سے اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی دامیں ٹانگِ زخمی ہوئی تھی۔ اسے چکر آ گیا تھا۔ کیرولین نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں اس کی کولھے کی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ مزار تاغ میں آرام کرنے کے باوجود وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا۔ گرنے سے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ تھکا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے ہم عمر چند بوڑھے ہی ان مشکل حالات سے دوچار ہوتے ہوں گے جن سے اسے دوچار ہونا پڑا تھا۔

جب ہمارے رخصت ہونے کا وقت آیا تو وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ روسا اسے سہارا دے رہا تھا۔ عیسیٰ نے اپنی بھاری بھنوؤں کے نیچے نم ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، مجھے برسوں پہلے کی وہ الوداع یاد آ گئی جب لارنس آف عربیا کی مہم کی پیروی میں اس نے میرے ساربان کی حیثیت سے میرا ساتھ دیا تھا۔ میں عیسیٰ سے سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن الفاظ اس کے اظہار کے قابل نہیں تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کچھ دیر کپڑے رکھا اور اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ یوں میں نے اس کے لیے تشك، احترام اور دوستی کے جذبات کا اظہار کیا۔ میں روسا کی طرف مڑا ”الوداع میرے دوست۔“ اس کا چہرہ اس کے افسوس کا غماز تھا۔ ہم جہاں بھی گئے وہ ہمارے ساتھ گیا، وہ ختروں کا سامنا کرنے سے نہیں گھبرا تھا۔ میں نے اسے گلے لایا۔ میرا گلارنڈہ گیا۔ میرے پیٹ میں بل پڑنے لگا اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے

لگ۔ میری آنکھوں سے آنسو روای ہو گئے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا، اپنی چہری سنبھالی، اور کارروائی کے آگے پہنچ کر آواز لگائی، چلو۔ آگے کے اوپر نے چنان شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ میں پیچھے مرکر نہیں دیکھوں گا، لیکن میں نے دیکھا عیسیٰ اور روسا کندھے سے کندھا مالائے کھڑے تھے۔ میں جاتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں میری روح میں اتری جا رہی تھیں۔ میں رونے لگا، آنسو جو انگستان سے رخصت ہونے کے بعد سے میرے اندر ضبط تھے۔ میرے گالوں پر بہنے لگے۔ تمام تر پریشانی، مشکل اور ڈر کے باوجود جو بلبلہ اب تک محفوظ تھا، پھٹ گیا، اس کے بعد جو تسلیم ہو وہ بھی بے حد و حساب تھی۔



باب 9

چینی قید خانہ

10- اکتوبر کی صبح کو جو ٹیم ناگوز بستی کے لیے روانہ ہوئی، یہ مختلف تھی۔ اس میں رچڑ، کیتھ، عیسیٰ اور روسا شامل نہیں تھے۔ دونے چہرے شامل تھے، مارک اور ایک عورت کا، عورت ایک چینی صحافی تھی۔ چیونگ چان اس کا نام تھا۔ گیونے مجھ سے کہا کہ اس خاتون کو ساتھ لے چلیں۔ اس سے چینی ذراائع ابلاغ ہماری مہم کو زیادہ اہمیت دینے لگیں گے۔ میں اس کے خلاف تھا، اس لیے بھی کہ ایک تو وہ ہمارا راشن کھائے گی اور دوسرے اس کا سامان، ہمارے کسی اونٹ کو اٹھانا پڑے گا۔ جب کہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ہر اونٹ مقررہ وزن ہی اٹھائے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اگلے سفر میں پہلے کی طرح اونچے اور مشکل پہاڑ اور ٹیلے پیش آنے کا بھی کم ہی امکان تھا۔ اس اعتبار سے کسی بڑے خطرے کی بھی پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے بالآخر گیو کا کہا مان لیا۔ وہ میرا ساتھ دینے آیا تھا۔ اس کی دل جوئی لازم تھی۔ میں جانتا تھا کہ چینی افسر کسی وقت بھی مہم کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ ناگوز بستی میں ہوا جہاں وہ کارروان میں شامل چینی ٹیم سے رابطہ کر سکتے ہیں تو کئی طرح کی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔

میرے خیال میں اگلے پڑاؤ تک مقابلتاً کم خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے شین کی وہ تحریریں پڑھی تھیں جو اس نے ڈائنن اولیک کے علاقے کے بارے میں لکھی تھیں۔ ڈائنن اولیک، مزاراتاغ کے پرانے قلعے اور ناگوز بستی کے درمیان

واقع ہے۔ یعنی جو راستہ ہم نے چنانچہ اس سے 60 میل جنوب کی طرف تھا۔ شیئں کی یادداشتیں پڑھ کر ہی باری نے سوچا تھا کہ وہ اس گاڑی کے ذریعے ڈائٹن اویلک تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن عملًا وہ غلط ثابت ہوا۔ صحرائے یا کسی کو بھی کوئی سہولت فراہم نہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہمیں اب جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کا کچھ تصور نہیں کیا تھا۔ ہماری ٹیم کو علیحدہ رہ جانے کا جتنا شدید احساس اب بدتر ہوا اس سے پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ ساری امیدیں اور اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کوئی گاڑی بھی اس جگہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی، جہاں اس وقت ہم تھے، اس لیے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی ہماری مدد کے لیے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ یہ جگہ شاہراہ ریشم سے 150 میل شمال میں تھی۔ چیونگ چان مہم جو نظر نہیں آتی تھی، اس نے نیلی جیز، نیلی جیک، چینی آرمی کے صحرائی بوٹ اور سڑا ہیٹ پہننا ہوا تھا وہ خاصی خوش شکل تھی۔ میں پیوندگی نیکر، پھٹی ہوئی قیص پہنے ہوئے مختلف نظر آ رہا تھا۔ تاہم میں پُرسکون تھا، اور وہ بھی۔ کیرولین، ہماری ٹیم کی واحد خاتون ممبر تھی، اس کا رعمل مختلف اور دلچسپ تھا۔

جب ہم مزارتان غ ہی تھے تو ہمارا ایک اونٹ کھل کر نکل گیا۔ سارے بانوں نے چار گھنٹے تک اسے تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ فیصلہ ہوا کہ اونٹ کو اس کی قسمت پر چھوڑا جائے۔ وہ سب سے کمزور اونٹ تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ 29 اونٹ جو نچ گئے تھے۔ ان میں سے آٹھ کمزور تھے۔ ان کا پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ دو دن کے آرام اور ہوتن کے کنارے سبزہ چلنے کے باوجود ان کی حالت نہیں سنبھلی تھی۔ سب سے بڑے اونٹ کے پچھلے کوٹھے پر ہاتھ بھر زخم تھا۔ جب وہ چلتا، زخم میں سے خون بینے لگتا۔ خوش قسمتی سے ہمیں ناگزور بستی میں دس نئے اونٹ مل جانے تھے، جو باقی ماندہ سفر میں ہمارے کام آتے۔ اندر ہے اونٹ کی حالت ایک مسافر سے زیادہ نہیں تھی۔ جب ہم ہوتن دریا کی خشک گودی کے قریب دو میل و سیچ وادی میں سے گزر رہے تھے تو انہا اونٹ درختوں کے سوکھے تنوں اور شاخوں میں الجھتا رہا۔ دو گھنٹے بعد ہم پھر سے ریتلے ٹیلوں میں آ پہنچے۔ ایسا لگا کہ پچھڑے ہوئے دوست مل گئے ہیں۔ اب چاروں طرف ریت دار ٹیلے تھے۔ آٹھ میل چلے ہوں گے کہ ہم نے پڑا ڈال دیا چینی خاتون خوش خرام ثابت ہوئی۔ اس کے چہرے سے تھکن کے آثار دکھائی نہیں دیتے

تھے۔ اس کے برعکس مارک پانی کی کمی کا شکار تھا۔ وہ شکایت کر رہا تھا کہ اس نے ایک مہینے تک امدادی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ پہلی بار کمپ کی فضائیں اتحاد کا عنصر نمایاں ہوا تھا۔ تیوں ثقافتی گروپوں میں جو اختلافات ابھر آئے تھے، ختم ہو گئے۔ مزار تانگ میں امدادی ٹیموں میں مشترکہ مقادیر اور مقاصد کا احساس نمایاں ہوا۔ صحراء بہارا دشمن نہیں تھا۔ ہمارے لیے اس میں کوئی حیرت بھی نہیں تھی۔ مارکیٹ سے مزار تانگ کے درمیان سفر نے ہمیں نیا اعتماد دیا تھا۔ میں نے نئے اعتماد اور فخر کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ صحراء کی تباہ خیزی اور عدم دوستی کو ہم نے کچھ وقت کے لیے ایک طرف رکھ دیا۔ صحراء کی مسحور کن خوبصورتی، خاموشی اور سکوت نے مجھ پر جادو کر دیا۔ صحراء کی ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی۔ بڑھے چلو، بڑھے چلو، اونٹوں کی گھنٹیاں بھی بھی صدا دے رہی تھیں۔

حیرت کی بات تھی کہ ساربان، اپنے بزرگ ساتھی عیسیٰ پولتا کی فرقہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے کریم کو نیا سربراہ تسلیم کر لیا تھا اور ایک ٹیم کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔ وہ عیسیٰ کی جھٹکیوں سے نجات پا جانے پر خوش تھے۔ عیسیٰ کو جو حادثہ پیش آیا اور سفر کے دوران میں اس پر مشکلات کی جو یلغار رہی، اس کے سبب سے وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی تیزی باقی نہیں رہی تھی، وہ سست ہو گیا تھا۔ میں بھی خوش تھا کہ عیسیٰ آنے والی آزمائشوں سے نفع گیا ہے۔ چینی بلند حوصلہ تھے۔ وہ چینی صحافی خاتون کے سامنے اپنی مردانگی کا اظہار کرنا چاہتے تھے یا رشتے پہاڑوں پر سے گزرتے ہوئے انہیں جو خود اعتمادی حاصل ہوئی تھی وہ ان کی خوش طبعی کی محک تھی۔ میں اس کا تینیں نہیں کر سکا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے کئی محکات تھے۔

ساربان نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے دریا کی گزراگاہ سے لکڑیاں اٹھا کر گھٹھوں میں باندھ کر اونٹوں پر لاد لیں۔ شام کے کھانے کے بعد ہم آگ کے گرد دائرے میں بیٹھ گئے۔ ہم میں سے بعض نانچے لگے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لکڑیاں جلنے سے جو خوشبو پیدا ہوتی ہے وہ ان کے نہنوں میں آ رہی تھی۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے خیالوں میں گم تھا، آگ اور ہوانے ہم پر جاؤ دسا کر دیا تھا۔ ہم بڑی دیر خاموش رہے۔ اونٹ کھانے کے لیے جھائزیاں تلاش کر رہے تھے۔ سونے کے لیے

جانے سے پہلے سارے باؤں نے اونٹوں کو پکڑا اور انہیں پانچ پانچ اور چھ چھ کے گروپ میں ایک ساتھ باندھ دیا تھا۔ اونٹوں نے مزار تاغ میں ایک جو ہر سے جی بھر کر پانی پیا تھا۔ اس لیے اب انہیں مزید پانی کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی صبح یا کنواں کھو دنا لازم تھا، نہ کھدائی کے لیے جگہ کا انتخاب کیا جانا تھا۔

لاوزہاد آلتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ شعلوں کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے کالے اور زرد اونٹوں میں سگریٹ دبایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ خالق نے اسے بنانے کے بعد، یہ دانت یک بارگی اس کے منہ میں چینک دیے تھے۔ اس نے چینی زبان میں حکایت سنائی جس کا مارک نے ترجمہ کیا۔ وہ کہاںی کچھ اس طرح تھی کہ ”خدا ایک روز بیٹھا مٹی سے انسانوں کے پتلے بنا رہا تھا۔ اس نے تین پتلے بنا کر پکنے کے لیے بھٹی میں رکھ دیے۔ ایک پتلہ اس نے پیچھے، دوسرا وسط میں اور تیسرا بھٹی کے دروازے کے قریب رکھا۔ کچھ دور دیر بعد اس نے دروازہ کھولا اور پتلوں کو باہر نکالا۔ جو پتلہ دروازے کے قریب تھا آگ سے دور ہونے کے سبب سے سرخ ہو گیا۔ خدا نے اسے اٹھایا اور چینک دیا۔ وہ یورپ میں جا گرا۔ جو پتلہ وسط میں تھا وہ آگ کے بہت قریب ہونے کے باعث کالا ہو گیا اسے بھی ہوا میں اچھا دیا گیا، وہ افریقہ میں جا اُترा۔ خدا نے بھٹی سے تیسرا پتلہ نکالا، اُس کا رنگ زرد تھا۔ خدا نے کہا کہ یہ اچھا ہے اور اسے چینی میں رکھ دیا۔“

موسم بدلنے لگا تھا۔ دن ٹھنڈا ہو گیا تھا، اوسط درجہ حرارت 80 فارن ہاست تک آگیا تھا۔ ہماری پیاس کم ہو گئی۔ پہلے ہم روزانہ تین لٹر پانی پیتے تھے۔ پندرہ روز بعد ڈیڑھ لٹر پانی کافی ثابت ہونے لگا۔ اب ہم کم مقدار پانی پی کر آٹھ گھنٹے تک چل سکتے تھے۔ مارک کم سے کم تین لٹر پانی پیتا تھا۔ اس کی قیص، پیٹھ پر پسینے میں شرابورہ تھی تھی۔ اب ہم روزانہ بارہ سے چودہ میل چلنے لگے تھے۔ تین دن اور ٹانگوں بستی سے آدمی مسافت رہ گئی تھی اور وہ حالات تسلی بخش انداز میں طے پار ہے تھے۔ 12 اکتوبر کی شام کو امدادی ٹیم سے ریڈ یو پر رابطہ قائم ہو گیا۔ یہ مزار تاغ چھوڑنے کے بعد پہلا رابطہ تھا۔ مارک نے ریڈ یو مجھے پکڑا دیا۔ میں نے بارنی سے بات کرنی چاہی۔ بات کرنا اور حالات اور واقعات پر نقد و نظر کرنا، ہمارا معمول بن گیا تھا۔ 19 اکتوبر کو مزار تاغ سے

روانہ ہونے کے بعد وہ ہوتن واپس آیا۔ اس نے رچڈ کو یہاں کی چھوٹی سی ایئر سٹرپ پر آتا را اور مہم کے آرٹسٹ پال ٹریزرا اور کرشنا گیو (کیمبرج کے گرینجویٹ) کو لے گیا۔ وہ قدیم آثار دیکھنے کے شوق میں یہاں آئے تھے۔ وہ اپنی سے ایک پرانے ہوائی جہاز پر روانہ ہوئے تھے، جس نے دورانِ سفر میں ان کو اتنا ڈرایا تھا کہ ان کے اوس ان خطا ہوتے ہوتے رہ گے تھے۔ کرشنا یوشیان گیا، وہاں سے دریائے کریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا ڈائٹن اویلک جانا چاہتا تھا۔ جان تھامس کا خیال تھا کہ اگر غیر ضروری سامان اتار دیا جائے اور گاڑی کے پہیوں سے ہوا نکال دی جائے تو چھوٹے ٹیلوں کو بآسانی عبور کیا اور تمیں میل مغرب میں پہنچا جا سکتا ہے۔ 1901 میں شین نے مبھی راستہ اختیار کیا تھا۔ بارفی اور جان نے اس کے کوائف کی بنا پر ہی یہ تیجہ اخذ کیا تھا کہ اگر گاڑیاں چلتی رہیں تو مقررہ مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ گاڑیوں کے ناٹروں پر باندھنے کے لیے خاص قسم کی تار موجود تھی۔ جان اسے دیلز سے لایا تھا۔ چنانچہ تار کو باندھا گیا لیکن بد قسمتی سے اس نے کام نہیں دیا۔ فرانس، جان کے پیچے پیچے آ رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر جان نے محسوس کیا کہ ریت اور زمین بہت نرم ہو گئی ہے۔ یہ تین ثن وزنی گاڑی کو نہیں سہار سکے گی۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر اور پیچے بھاگا تاکہ بعد میں آنے والی گاڑی کو روک سکے لیکن اس کے پہنچتے پہنچتے گاڑی کا اگلا حصہ ریت میں ڈھنس گیا تھا۔ بارفی اور فرانس صدمے کی کیفیت میں اپنی نشتوں پر بیٹھے رہے۔ انہیں کیا حادثہ پیش آ گیا تھا، اس کی شدت کا انہیں فوری طور پر پتہ نہیں چلا تھا۔ جان نے پورے زور سے چیخ کر کہا کہ ”اترو، اترو جلدی کرو، گاڑی کے ساتھ تم بھی ریت میں ڈھنسا چاہتے ہو۔“ گاڑی کا اگلا حصہ بڑی تیزی سے ریت میں ڈھنس رہا تھا۔ بارفی اور فرانس ریگتے ہوئے گاڑی کی جھست پر پہنچ اور پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ پچھلی نشست پر ریڈیو اور سیٹلائٹ مواصلات کے قیمتی آلات پڑے تھے۔ بارفی نے پکار کر جان سے کہا کہ اپنی گاڑی کا رسما پکڑا تو تاکہ اب اسے چیخ کر نکالا جاسکے۔ جان نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری گاڑی کے ساتھ یہ گاڑی بھی ریت میں ڈھنس جائے؟ فریقین میں کافی چیخ چیخ ہوئی، لیکن جان نہیں مانا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ صحیح تھا۔ دونوں گاڑیاں ریت میں ڈھنس کر مفلوج ہو

جاتیں تو پوری مہم خطرے میں پڑ جاتی۔ اگلی گاڑی سے جتنا کچھ سامان نکالا جا سکتا تھا، نکال لیا گیا۔ اب وہ بینچ کر گاڑی کو کھڑکیوں تک ریت میں دھنسا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مہم کے آسٹرین سرپرستوں نے 80 ہزار پونڈ سڑنگ قیمت کی یہ گاڑی عطیہ کی تھی۔ صبح ہوئی تو امدادی ٹیم نے گاڑی کو اسی حالت میں پایا جس میں وہ سوتے وقت اسے چھوڑ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رات کے دوران میں وہ پوری طرح ریت میں ڈھنس جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا۔ بارنی کو امید بندھی کہ اسے نکالنا ممکن ہو جائے گا۔ اسے یاد آیا کہ گزشتہ دنوں میں وہ سنکریٹ کی بنی ہوئی ہیرکوں کے پاس سے گزر ا تھا۔ وہاں اگر فوجی موجود ہوئے اور مدد کو آئے تو ممکن ہے کہ گاڑی نکالی جاسکے۔ اس نے چینیوں کے ترجمان سے پوچھا کہ وہ پیچھے جن ہیرکوں کے پاس سے گزر کر آیا ہے، کیا وہ فوجی ہیں؟ اسے جواب ملا فوجی نہیں، درحقیقت وہ کسانوں کے لیے قید خانے تھے، جن میں انقلاب کے دوران میں بھاگ جانے والے چینیوں کو سزا کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ جان کی گاڑی میں وہ سب پیچھے روانہ ہوئے اور صحراء میں اوپھی دیواروں والے کیپ تک پہنچ گئے۔ اس کے چاروں کنوں پر اوپھی چٹانیں بنی ہوئی تھیں، جہاں مسلک پہرے دار بینچ کیپ کی گمراہی کرتے۔ بے شینی کے عالم میں وہ کیپ کے سامنے دروازے پر آئے دو سلسلے پہرے داروں نے ان کو روکا۔ انہیں قید خانے کے گورنر کے دفتر لے جایا گیا۔ جو انہیں اپنے ساتھ مچان پر لے گیا۔ قیدی ٹھن میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ اتنے میں سیٹی بھی اور سارے قیدی اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے کردوں میں چلتے گئے۔ جہاں انہیں چوبی بستروں کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ ایک کونے میں ٹائلٹ تھی۔ واپس دفتر آئے تو مہماںوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔ گورنر نے پوچھا کہ ان کی کیا مدد کی جاسکتی ہے۔ بارنی نے کہا کہ ہمیں کچھ آدمی چاہیں جو ریت کھود کر ہماری گاڑی کو نکالیں۔ گورنر نے 200 قیدیوں کو اس کام کے لیے بھیج دیا اور پوچھا کہ ”بل ڈوزر“ چاہیے تو بتایے۔ بارنی نے ہای بھری تو گورنر بل ڈوزر لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ تین دن لگاتار کوشش کی جاتی رہی کہ کسی صورت گاڑی ریت سے نکالی جاسکے۔ کیتھ فوٹو کھینچنے میں مصروف رہا۔ وہ خوش تھا کہ اسے ریت میں چلنے اور اونٹوں کی نکیل پکڑ کر رہنمائی کرنے سے نجات ملی ہوئی تھی۔ بارنی مرغابیوں کے دریا

میں اترنے اور وہاں سے اٹنے کا نظارہ کرنے میں اس قدر کھو گیا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ جان نے گاڑی کی بازیافت کی نگرانی کرنا شروع کر دی اور بیل ڈوزر کے ڈرائیور کو حکم صادر کرنے لگا۔ اس کے حکم کا چینی میں ترجمہ ایک قیدی کرتا تھا آخری کوشش کے طور پر گاڑی کے گرد کا کچھ صاف کرنا شروع کیا گیا۔ اس طرح گاڑی پر دباؤ کم کرنے میں مدد ملی، گاڑی کا اگلا حصہ آہستہ آہستہ ریت سے باہر آنے لگا۔ امدادی ٹیم نے اس یقین کے ساتھ کہ گاڑی نکل آئے گی، واپس جانے کی ٹھانی۔ اس نے یوں جانا تھا اور ڈیڑھ دن بعد ناگوں بستی میں دوسری ٹیم سے جامنا تھا۔ یہاں سے انہیں ضروری سامان لینا تھا۔

ان تین دنوں میں امدادی ٹیم نے بنیادی ٹیم کی مشکل آسان کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے سوچا کہ اصل کام انجام پا چکا ہے۔ اب یہاں تھہرے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ باری نے صورت حال کی عینکی کا احساس ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ ہر شام اپنے ریڈیو سے یہی بتاتا کہ ٹیم کا حوصلہ بلند ہے، درپیش مشکلات چاہے کتنی جاں گدراں ہیں، ہم بڑی ہمت سے برداشت کر رہے ہیں۔ باری کی ٹیم سے چینی حکام نے پوچھ چکھ کی۔ باری کی چینی ترجمان اپنے ہی لوگوں کے سامنے جمل ہوا، اسے خیال گزرا کہ کہیں اسے مہم میں ترجمان کی حیثیت سے شرکت کی بنا پر قید خانے میں نہ ڈال دیا جائے۔ باری کے لیے مہم کی مقصدیت واضح کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ اگرچہ اسے شاہراہ ریشم کے ساتھ سفر کرنے کی اجازت ملی ہوئی تھی، اسے اس وقت تک وہاں سے جانے کی ممکنگی کر دی گئی جب تک کہ وہ ناگوں بستی کی طرف جانے پر تیار نہیں ہو جاتا۔ بڑی روقدح کے بعد اس سے ایک دستاویز پر دستخط کرائے گئے۔ اس میں کیا لکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا، غالباً یہ بیل ڈوزر کے 25 پونٹ کرائے کی ادائیگی سے متعلق تھی۔



باب 10

سب لوگوں کا خواب

امدادی نئیم 12 اکتوبر کو گاڑی نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ میں اور گیو جن والی ریت کے ایک ٹیلے پر کندھے سے کندھا مالائے بیٹھے تھے۔ ہم نے 18 میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ گرمی کے مارے میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ میرے پاس صرف دو ہونٹ پانی رہ گیا تھا۔ گیو نے اپنا آخری سگریٹ سلاکایا، دو تین کش لیے اور پھر سگریٹ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے گیو کا شکریہ ادا کیا اور سگریٹ کا بڑا کش لیا۔ چینی سگریٹ پیتے پیتے میں ان کی کڑواہٹ برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ سگریٹوں کے چار ہزار پیکٹ ہمیں عطیے کے طور پر ملے تھے۔ میں اپنے باپ کا پاسپ لے آیا تھا۔ اس کا مجھ پر طسمی اثر تھا۔ میں نے اپنے باپ کی ریشمی جیکٹ بھی پہن رکھی تھی، جو پھٹ گئی تھی۔ ان چیزوں کی بنا پر مجھے چلتا پھرتا عجائب گھر کہا جا سکتا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل، ڈھکنا کھول کر گیو کی طرف بڑھائی۔

گیو بہت کمزور ہو گیا تھا، پیاس اور تھکن نے اسے ملنے جلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا پانی دوپہر تک ختم ہو گیا تھا۔ اس نے میری بوتل کا سارا پانی پی لیا۔ ہم قافلے کے آخری دوار کان تھے۔ میں نے روپرٹ اور مارک کو اونٹوں کے ساتھ آگے بھیج دیا تھا تاکہ وہ کبکپ قائم کرنے اور پانی کے لیے کنوں کھدوانے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر سکیں۔ اونٹوں کو پانی پیئے تیرایا چوتھا دن تھا۔ صحرائیں رہتے رہتے ہم اس کے عادی ہو گئے تھے۔ پانی کے بارے میں ہماری تشویش کم ہوتی گئی تھی۔ تاہم

اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ صحراء میں پانی ملنے کی ضمانت نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور ہمارا پیچھے مژانا محل تھا اور آگے بڑھنے کے لیے پانی درکار تھا۔ اب ہمارے لیے یہی لازم تھا کہ آگے بڑھتے اور اپنی منزل کے قریب تر ہوتے جائیں۔ دن بھر ریت میں چلتے رہنے کے بعد جب تھک ہار جائیں تو پانی کی تلاش میں کنوں کھو دنے لگیں۔ یہ بڑا صبر آزمایا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اونٹوں کو قابو میں رکھنے کی مشقت بھی ساتھ رکھنا پڑتی تھی۔

میں اور میرا چینی ساتھی بیٹھے تھے، ہمارے گرد و پیش میں ریت ہی ریت تھی۔ صحراء کی وسعت تھی اور ہماری تہائی تھی۔ ہمارا دار و مدار اپنی ہست اور اونٹوں کی معیت پر تھا۔ ہم دونوں کے بچے تھے۔ ہم صحراء کا سفر کرنے کی بجائے گھروں میں آسودگی سے رہ سکتے تھے اور آئے روز کی آفت جھیلنے کی بجائے بچوں کے درمیان ہنسی خوشی دن گزار سکتے تھے۔ یہ خیال بھی آتا کہ آگے نہ جانے کوں سی مشکلات اور رکاوٹیں ہمارا راستہ روکیں گی۔ ہم ناامیدی کا شکار ہو کر اپنی ہمہ سے دست بردا نہیں ہو سکتے تھے۔ زندگی میں مستقبل کی ضمانتی کسی کو میر نہیں آتیں۔ بس ہم لحظہ بہ لحظہ زندگی بر کرتے ہیں۔ آگے کے احوال کا ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہماری زندگی تو اس ٹرین کی مانند ہے جو سیدھی جاری ہوتی ہے اور راستے میں کئی مخفی لائیں دائیں باعیں پھوٹی چلی جاتی ہیں۔ ہر لائن ایک نئے تجربے اور نئی منزل کی طرف جاتی ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ٹیلوں کے سامنے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ کارروان نے جو راستہ بنایا تھا وہ ریت سے ڈھک جائے گا۔ ہم نے صحراء پر کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ ہم کس راستے سے گزرے؟ کوئی نہیں جانتا ہو گا۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ حادثے یا بیماری کی صورت میں ہماری مدد کو کون آتا؟ ہر روز ایک سامنظر ہی دیکھنے کو ملتا اور ہر روز ایک سی مشکلوں کا سامنا ہوتا۔ خطرے، پیلیقینی، بیماری، بوریت کے علاوہ بھوک، پیاس کی آزمائش ہمارے لیے نہیں رہ گئی تھی۔ ہم نے ان سے مطابقت پیدا کر لی تھی۔

خیال کریں، گیونے مارکیٹ سے لے کر آج تک 270 میل کا فاصلہ طے کیا ہے۔ ہم نے تو اس سے بھی دور سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یوں سمجھنے کہ افق سے، جہاں سورج غروب اور طلوع ہوتا ہے۔ کیا ہم پاگل ہیں؟ لیکن ہمارے کچھ خواب ہیں،

جن کی تعبیر کے لیے ہم مصروف جہد ہیں۔ گیو اور میں ایک ہیں۔ اب تک جو کچھ کیا ہے، ہم نے مل کر کیا ہے۔ ہم نہ ہوتے تو دوسرے بھی نہ ہوتے۔ ہم دونوں نے اگر یہ نہ سوچا ہوتا کہ ہم جو کچھ کرنے جارہے ہیں، وہ ممکن ہے، ہم نے اس کے لیے مشقت جھیلی ہے، سزا کے طور پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے۔ یہ لمحہ ہمارا ہے۔ اس کامیابی میں ہمارا حصہ ہے۔ میں نے اپنا بازو اس کے کندھوں پر ڈال کر اسے چھاتی سے لگایا۔ گیو شرم گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواؤ تھے۔ ”تم کیا محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں فخر محسوس کر رہا ہوں،“ اس کا جواب تھا، ”مجھے فخر ہے کہ ہم تاریخ بنا رہے ہیں۔ ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جو کبھی کسی نے نہیں کیا۔ میں اور آپ دونوں کی ٹیم بہت اچھی ہے۔ اب آؤ چلو، ہم یہاں بیٹھے رہے تو اونٹ ہم سے میلوں دور نکل جائیں گے۔ رات ہو گئی تو انہیں اندر ہیرے میں نہیں دیکھ سکیں گے۔“

ہم کے آغاز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو دل میں جھانک کر دیکھا تھا اور اپنی کامیابیوں کا اعتراض کیا تھا۔ ہیڈن اور ٹین کی روحلیں موجود ہوتیں تو تسلیم کرتیں کہ ہم ان کے صحیح پیروکار ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ لارنس نے ”سیوں پلر ز آف وزڈم“ میں لکھا ہے کہ تمام لوگ خواب دیکھتے ہیں لیکن ایک سے نہیں۔ جو رات کو خواب دیکھتے ہیں صبح انہیں بھول جاتے ہیں، لیکن جو دن میں خواب دیکھتے ہیں وہ خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں پر عمل کرتے ہیں اور انہیں سچا ثابت کر سکھاتے ہیں۔ یہی کچھ میں نے کیا۔

کارروان کو جالینے کے لیے ہمیں ایک گھنٹے تک تیز قدموں سے چلتا پڑا۔ اس دن شام کا اندر ہیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیلے عجیب شکل اختیار کر رہے تھے۔ ہم آخر میں چلنے والے تین چینیوں تک پہنچ گئے تو دیکھا کہ ایک اونٹ جس پر سامان کے تھیلے لدے تھے، اس کی پچھلی ناگ سے خون بہرہ رہا ہے۔ اس کا سامان ایک طرف ڈھلک گیا تھا اور دن بھر اس کی ناگ سے رگڑ کھاتا رہا تھا۔ جس سے بہت بڑا خشم بن گیا تھا۔ میں نے ہر ایک کو زخمی اونٹ کے گرد جمع کیا اور کہا کہ تم میں سے بعض اپنا کام صحیح طرح نہیں کر رہے۔ ہمارا ایک اور اونٹ زخمی ہو گیا ہے۔ وہ کل سامان نہیں اٹھا سکے گا۔ کیرولین بولی، ہم تو دن بھر کارروان کے آگے چلتے رہے۔ پیچھے کیا ہو رہا تھا، ہمارے

علم میں نہیں تھا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ مجھے پتہ ہے لیکن میں ہر ایک کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ حواسِ مجتمع رکھے۔ کیرولین نے مجھ سے بحث کرنا شروع کر دی۔ میں سمجھا کہ وہ کسی دباؤ میں ہے اور بہت تھک چکی ہے۔ خوش قسمتی سے ریوپرٹ اسے ایک طرف لے گیا اور صلح صفائی کر دی۔ وہ جھگڑے اور غلط فہمی دور کرانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

ریوپرٹ کا اصرار تھا کہ اندر ہمراہ ہو جانے کے باوجود وہ اور میں اونٹوں کو دیکھیں۔ میں تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھا کر سونا چاہتا تھا۔ تاہم وہ صحیح تھا۔ نارچ لے کر اونٹوں کو دیکھنا شروع کیا، 29 اونٹوں میں سے بارہ کو زخم آئے ہوئے تھے۔

چارلس نے ریوپرٹ سے کہا کہ ہمیں ہر روز اونٹوں کا معافانہ کرنا چاہیے۔ اس نے اتفاق کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنی میل کیمل کور کے قواعد و ضوابط پڑھے جو پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مرتب ہوئے تھے۔ ایک اونٹ کے کوہاں پر بڑا زخم ہو گیا تھا۔ یہ اس رستے سے بنا تھا جس سے اونٹ پر سامان باندھا گیا تھا۔ اونٹ کو لٹا کر اس کے زخم سے خون اور پیپ کو دبا کر نکالا گیا۔ اس میں آئی ڈین ڈالی گئی۔ دوسرے دن ہم دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ایسی جگہ ٹھہرے جہاں ریت کے ٹیلوں میں پرانے درخت اور ان کے تنے کھڑے تھے۔ لاڈ زہاد نے بتایا کہ یہ ایک ہزار سال پرانے ہیں۔ پانچ سو برس پہلے یہ سوکھ گئے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں جنگل تھا جس میں طرح طرح کے جانور تھے۔ زمانہ قدیم میں تارم کے طاس کا رقبہ، بیکرہ روم کے برابر تھا۔ یہ علاقہ ہیڈن اور شین کے ان فوٹوؤں سے ملتا جلتا تھا، جو انہوں نے قدیم آثار کی تلاش کے سلسلے میں کھینچے تھے۔

میں نے ریوپرٹ اور مارک سے کہا کہ وہ اونٹوں کو آگے لے چلیں۔ میں بھی پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔ میں اس دوران میں علاقے کا جائزہ لے لوں گا۔ ہم نے اپنے سامان اور ریڈی یو آلات کو دوبارہ اچھی طرح دیکھ بھال لیا تاکہ آگے چل کر کسی چیز کی کی کامان نہ کرنا پڑے۔ ریوپرٹ نے اونٹوں کو آگے لے کر چلتے ہوئے کہا کہ میں نصف گھنٹے بعد ریڈی یو پر راستے کے بارے میں بتاتا رہوں گا۔ کیرولین نے پوچھا چارلس کیا بات ہے؟ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ بس اس جگہ کے بارے میں مجھے

کچھ عجیب سالگ رہا ہے۔ یہ ہوتا اور کیریا دریاؤں کے درمیان کا علاقہ ہے۔ ڈائٹن اویلک اور کارا ڈائٹ سے کچھ زیادہ دور نہیں، جو ہیدن اور اپریل شین نے دریافت کیے تھے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، ممکن ہے بہاں کوئی اور آثار مل جائیں۔

کارروان ٹیلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ میں نے آدھ گھنٹے تک قدیم جنگل کے آثار کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں مجھے کچھ نہیں ملا۔ میں اپنے قدموں کے نشان دیکھتا ہوا اپس ہوا۔ میں نے اپنا قطب نما نکالا اور کارروان کی کھوج لگانے کی کوشش کی۔ میں نے دوسو فٹ بلند ٹیلوں پر چڑھ کر مشرق کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ خیال تھا کہ مجھے اونٹ نظر آ جائیں گے۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ مجھے پہلی بار صحراء کی وسعت اور خاموشی کا مکمل احساس ہوا اور اس منظر میں مجھے اپنا وجود بہت چھوٹا اور حقیر نظر آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تم ایک عمدہ مثال قائم کر رہے ہو۔ تم نے کارروان سے علیحدہ ہو کر اچھا نہیں کیا۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا؟ پانی کی آدھی بوتل، ایک ریڈیو، ایک شیشہ، ایک قلم تراش اور قطب نما۔ میں ہمیشہ اپنے پاس ایک دن کا راشن، ضروری دوا میں اور کچھ کپڑے ضرور رکھتا رہا ہوں۔ میں نے روپرٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے آئینے سے مشرق کی جانب اشارہ کیا، لیکن سورج ڈور جنوب کی جانب تھا اس لیے میں صحیح سمت میں روشنی منعکس نہ کر سکا۔ تھائی کے باعث مجھ پر جو حشمت طاری ہونے لگی اسے کم کرنے کے لیے میں نے زمین کا اس انداز سے معائنہ کرنا شروع کیا جس کی ہمیں فوج میں تربیت دی گئی تھی۔ میں نے زمین کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک سامنے کا، دوسرا درمیانی اور ایک پیچھے کا۔ میں نے ٹیلوں حصوں کا بغور جائزہ لیا۔ پھر سامنے کے ٹیلوں کی طرف دیکھا کہ شاید ان میں کسی قسم کی حرکت نظر آ جائے۔ لیکن کہیں کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ میں گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ میں کب تک تھائی میں زندہ رہ سکوں گا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جنوب مشرق کے رخ پر چلتا جاؤں۔ میں جتنی دور جاؤں گا، کارروان سے اتنا ہی ڈور ہو جاؤں گا۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر جانتا تھا کہ کارروان جتنا فاصلہ طے کرے، اس کا پیچھا کرنے والا، اس

تک نہیں پہنچ پائے گا۔ میں 24 منٹ تک چلا اور ٹیلوں کے ایک سلسے تک پہنچ گیا اور ایک بار پھر اپنا طریقہ آزمایا۔ اس دفعہ کامیاب ثابت ہوا۔ مجھے کارروان کی سمت معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے رخ چلنے شروع کیا۔ جہاں زمین ہموار ہوتی وہاں دوڑنے لگتا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایک اوپنچے ٹیلے پر پہنچا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ پیاس کے باوجود میں نے پانی نہ پیا کیوں کہ ابھی آدھے دن کی مسافت باقی تھی۔ میں کسی سے پانی مانگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس دوران میں کسی کو آئینے سے عکس ڈالتے دیکھا۔ مجھے کسی نے دیکھ لیا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ ریڈ یو آن کیا۔ روپرٹ کی آواز آئی۔ ”ہیلو چارلس، میں روپرٹ ہوں، ہم تو ڈرے ہوئے تھے کہ تم زندہ بھی ہو۔“ میں مکرا دیا اور کہا کہ تم آہستہ آہستہ چلتے رہو میں تھوڑی دیر میں تم سے آ ملتا ہوں۔ میرے ساتھ کیا بیٹی، میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں ان سے جاملا۔ مجھے جو سبق ملا وہ میں بھی نہیں بھولا۔ دوسروں نے بھی اس سے سبق لیا۔

ایک سہ پہر میں مارک اور لاڈ زہاؤ کے ساتھ کارروان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہم ٹیلوں کی ایک قطار پر جا پہنچ، وہاں سے ہم نے نیچے دیکھا تو آدھا میل چوڑا ایک گزہا نظر آیا۔ اس کے گرد رختوں کے تنے اور چھٹھ پڑے ہوئے تھے۔ یہ نہ تو کسی قدیم دریا کی گزرگاہ تھی اور نہ کوئی وادی تھی جسے ٹیلوں نے گھیر رکھا ہو۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ مارک خاموش رہا۔ لاڈ زہاؤ بولا، یہ قدیم زمانے کی جھیل تھی۔ جس سے ڈانٹن کو پانی ملتا تھا۔ سییون ہیڈن نے 1895 میں پہلی مرتبہ ڈانٹن کے آثار دریافت کیے تھے۔ یہ پراسار بستی، نجلستان کے باسیوں نے آباد کی تھی اور اسے ”تکلا مکان“ کا نام دیا تھا۔ اب یہ ریت میں فن ہو گئی تھی۔ شین پاچ برس بعد یہاں پہنچا تو اس وقت اس کے آثار معدوم ہو چکے تھے۔ ہیڈن کا کہنا تھا کہ دریاۓ کسیا کسی اور راستے پر بہت تھا اور اس کی نہروں سے بستی کو پانی ملتا تھا۔ دریا سوکھ گیا تو آٹھویں صدی میں اس بستی کے لوگ نقل مکانی کر گئے۔ شین نے اس نظریے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکا کہ پانی کہاں سے آتا تھا۔ ایک سو برس بعد ہماری ہم نے اس کا جواب ڈھونڈ نکالا۔

14 اکتوبر کو کارروان بکریوں کے چواہوں کی بستی ناگور بستی میں پہنچا۔ یہ

شہرہار ریشم سے 110 میل شمال میں، اس وادی میں واقع ہے، جس میں دریائے کرمیا بہتا ہے۔ اس دریا میں کیون لیون پھاڑوں کا پانی آتا ہے۔ یہ وادی پاپولر درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ بلوط کے درختوں اور جھاڑیوں کی بھی افراط ہے۔ اس سبزے نے ریت کے سامنے حصار قائم کر رکھا ہے۔ بعض مقامات پر یہ وادی ایک میل چوڑی ہے اور بعض جگہوں پر صرف چند سو گز، اس وادی کا یہاں قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کہ کبھی یہاں بودھوں کا عمل دخل رہا ہو۔ گیوجن والی کا کہنا تھا کہ نانگوزویستی میں کل پچاس خاندان آباد تھے، جنہوں نے شاید ہی کبھی یہاں سے باہر جانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ علاقائی چینی حکومت نے وہ برس ان لوگوں کو آباد کرنے اور تکلا مکان کے قبیلے کو جدید تہذیبی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ یہاں ایک سکول کھولا گیا۔ گاؤں میں ایک ہال تعمیر کیا گیا۔ ایک ڈیزل جنریٹر کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی۔ ایک درجن پنچتہ مکان تھے جو آسودہ حال خاندانوں کی ملکیت تھے۔ ان کی کھڑکیوں میں شیشے نہیں تھے۔ 1900 تک کاشغر میں کھڑکیوں میں شیشے لگانے کا رواج نہیں تھا۔ شیشے کی جگہ موی کاغذ لگایا جاتا تھا۔ کچے مکان عام تھے، وہ پاپولر درخت کی لکڑی سے بنائے جاتے، اسی درخت کی شاخوں اور گھاس سے چھت ڈالی جاتی۔

امیر نے ایک مقامی شخص کو گھٹے پر جاتے دیکھا تو اس سے علیک سایک کی۔ اس کا عجیب حلیہ تھا، اس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔ اس کا منہ دانتوں سے خالی تھا۔ اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹ نہ لیا۔ مارک نے کہا کہ یہ گاؤں کا کوئی مسخرہ ہے۔ اس نے اتنے بہت سے اوٹ، کئی یورپی لوگ اور ان کا ساز و سامان دیکھ کر بھی کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ کیرولین کا کہنا تھا کہ شاید وہ ہر ہفت ہم جیسے لوگ دیکھتا آ رہا ہے۔ امدادی ٹیم ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ہم نے اوٹوں سے سامان اتنا را۔ جب سے انہوں نے ریت میں دھنسی ہوئی گاڑی نکالی تھی، ہمارا ان سے ریٹی یو پر رابطہ نہیں ہوا تھا۔ شام ہوئی تو وہ آپنچے اور ہمیں جنوبی شہرہار ریشم پر پیش آنے والے واقعات سنانے لگے۔

میں نے بارنی سے کہا کہ تمہیں ہم سے بڑھ کر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔

وہ اپنے ساتھ ڈاک کا وہ تھیلا بھی لایا تھا جو پال ٹریپر انگلستان سے لایا تھا۔ ہم باری کے گرد جمع ہو گئے۔ جس نے ہمیں خطوط اور پارسل تقسیم کیے۔ ہم اپنے خطوط اور پارسل لے کر ایک کونے میں چلے گئے تاکہ علیحدگی میں اپنے خطوط پڑھ اور پارسل دیکھ سکیں۔ ایسا تخلیہ کم ہی نصیب ہوتا رہا ہے۔ دو گاڑیوں کے آنے سے بڑی گہما گہما ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان کے گرد جمع ہو کر شور چانے لگے۔ باری نے انہیں بچہ (badge) دیے، جو انہوں نے اپنے سینوں پر لگا لیے۔ ان میں سے ہر بچہ خوش تھا جیسے اسے کوئی بہت بڑا اعزاز مل گیا ہو۔ بلکہ پا کروہ اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔ ماں میں اپنے بیمار بچے لے آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ان کے بچوں کو بیماری سے نجات دلا سکتے ہیں۔ کیرولین نے انہیں دوائیں دینا شروع کیں۔ کسی کو کم، کسی کو زیادہ۔ ہمارے پاس دوائیں بے مشکل ہماری ضرورت پوری کرنے کے لیے تھیں۔ جنہیں کم ملتیں، وہ اصرار کرتے کہ انہیں اور دوائیں دی جائیں۔ میں نے سوچا کہ جب ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے تو بیمار بچوں کا کون پر سان حال ہو گا۔

رات کو گاؤں والوں نے خوبصورت رقص پیش کیے۔ رقص کرنے اور دیکھنے والوں نے رنگارنگ لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے پیچے سکول کے بارے میں بیڈ تھا جس میں سازوں پر مقامی دھنیں اور گیت پیش کیے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے اگلی صفوں میں شم دائرے میں بیٹھے تھے۔ باقی لوگ ریت پر نشستیں جمائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے کھیا، پارٹی کے چند عہدے داروں اور ہمیں بچوں پر بھایا گیا تھا۔ بچے دیکھ کر مجھے اپنے تین بچے یاد آئے۔ بیٹنا نے مجھے 22 صفحے کا جو خط لکھا تھا، میری جیب میں پڑا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ہاؤ ہو ختم ہو اور مجھے فرصت ملے تو میں یہ خط سکون کے ساتھ پڑھ سکوں اور بیٹنا اور بچوں کے بارے میں جان سکوں کہ کیسے ہیں اور ان کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ ناگوں بستی وہ آخری مقام تھی، جہاں ہمیں ڈاک مل سکتی تھی۔ اس کے بعد کم سے کم دو ہیئے انتظار کرنا پڑتا، جب تک ہم صمرا کو عبور کر کچے ہوتے۔ رقص کے بعد ہماری دعوت کی گئی، جس میں لہو و لعب کا قریباً بھی سامان تھا۔ صبح ہوئی تو سب کے چہروں پر رات کی دعوت کے آثار موجود تھے۔ ناگوں بستی میں نو اونٹ بد لے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نئے اونٹ لیے

گئے۔ پہلے اونٹوں میں سے ایک انداھا ہو گیا تھا، دوسرا کی ایک آنکھ بند ہو گئی تھی۔ تین بہت چھوٹے تھے اور سفر کے آخری مرحلے میں جتنے سامان کی ضرورت تھی، یہ اسے اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ نئے اونٹ، پہلے اونٹوں کی طرح تدرست اور تو انا نہیں تھے۔ بہر حال ہمارے کام آ سکتے تھے۔ اب اونٹوں کی تعداد پھر سے تیس ہو گئی تھی۔ نئے اونٹوں کے ساتھ دو نئے سارپاں بھی آئے۔ ایک کا نام سلیمان موئی اور دوسرا کا عبدال الدین، سلیمان بڑی عمر کا باریمیش آدمی تھا۔ وہ اونٹوں کو پالنے اور یہچنے کا کاروبار کرتا تھا۔ عبدال کی عمر 30 کے لگ بھگ تھی۔ اس نے یہ مغربی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال لمبے تھے، اس نے شیوکر رکھی تھی۔ اس کی موچھیں ہلکی اور باریک تھیں۔ وہ اونٹوں کو سنبھالنے کا ہنر جانتا تھا یا نہیں، اس کے پارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کریم یونس نے عیسیٰ پوتا کی چکہ لی تھی۔ آخری ایک سومیں کے سفر کے دوران میں پتہ چلا کہ وہ لاری ڈرائیور ہے۔ ہم میں شامل ہونے سے پہلے اس نے اونٹوں کے بارے میں کہی سوچا بھی نہیں تھا۔



باب 11

المغیور ساربان

میں امدادی پارٹی سے ایک طرح کا حسد کرنے لگا تھا، وہ شاہراہ ریشم پر زندگی کے مختلف تجربات سے گزری تھی۔ اس نے اس کے بازاروں کی رنگارنگی دیکھی تھی اور لوگوں کے متنوع تقاضوں کا مطالعہ کیا تھا، جن کے اجداد نے علاقے کی تاریخ کو جنم دیا تھا۔ جن سارے بانوں (المغیور) نے ہمارے ساتھ صحراء بور کیا تھا ان کی حیثیت سارے بانوں کی تھی۔ وہ اقیت میں تھے۔ ایک ہزار سال قchl وہ ٹرک خانہ پدوش تھے، جن کی گزر بسر مویشی پالنے پر ہوتی تھی۔ وہ الٹائی پہاڑوں سے اتر کر اس علاقے میں آبے۔ جواب سنگیاں گک کہلاتا ہے۔ انہوں نے ترپان میں اپنا دار الحکومت قائم کیا۔ دسویں صدی تک المغیور یا مشرقی ترک اس علاقے کے حاکم تھے۔ شاہراہ ریشم کے شمالی حصے کے ساتھ تجارت پر ان کا کنٹرول تھا۔ اس وقت وسطی ایشیا میں تین مذاہب رانگ تھے۔ بدھ مت، من جاؤ ازم اور نسخورین عیسائیت۔ مختلف ادوار میں المغیور یہ مذاہب اختیار کرتے گئے۔ تیرھویں صدی میں انہوں نے منگولوں مسلم آوروں سے تعاون کر کے اپنے آپ کو تباہی سے بچا لیا۔ انہوں نے منگولوں سے شادی بیاہ کر کے اور انہیں تہذیب و تجارت کے فوائد سے روشناس کر کے نئے راستے پر ڈالا۔ منگولوں کا اس وقت تک کوئی تحریری رسم الخط اور زبان نہیں تھا۔ انہوں نے المغیور کا رسم الخط اختیار کر لیا۔ انہوں نے نسخورین عیسائیوں سے رسم الخط لیا تھا۔ چودھویں صدی کے اوآخر تک المغیوروں نے اپنے منگول آقاوں کی طرح اسلام قبول کر لیا۔ تمام بودھ، من جینن اور

نستورین معبد اور خانقاہیں تباہ کر دی گئیں۔ جب تک منگولوں کو قبلائی خان کے عہد تک علاقے میں حاکمیت حاصل رہی، چین پر المغیور کا غلبہ رہا۔ پندرھویں صدی میں منگ خاندان نے منگولوں اور المغیور کو نکال باہر کیا۔ جس کے نتیجے میں وسطی ایشیا اور چین کے درمیان تجارت بند ہو گئی، اس سے المغیور کا زوال ہوا۔ انہیوں میں صدی میں یعقوب بیگ نے مشرقی ترکستان کا حاکم ہونے کا دعویٰ کیا لیکن 1877ء میں چینی فوج نے اس کی شکنی کر دی۔ 1930ء اور 1940ء تک کے عرصہ کے سوا جب یہ علاقہ سوویت یونین کی تحویل میں تھا اس پر چین کی عمل داری رہی۔ کبھی کبھار بے چینی کے آثار نہ مایاں ہوتے۔

مسلمانوں کی بے چینی اور المغیور کے مطالبہ آزادی سے جو باہم مربوط ہیں چینی خائف رہے ہیں۔ اسی بنا پر مرکزی حکومت نے اس علاقے کے بارے میں مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ جن دنوں ہماری مہم چلی، صوبے کا گورنر المغیور تھا۔ لیکن اصل طاقت چینی پارٹی کے ہاتھ میں رہی اور پارٹی بیجنگ کے مکمل اثر میں تھی۔ صوبہ سکیانگ میں مقامی حکومت کی ہر سطح پر پارٹی کے نمائندے شامل تھے۔ صوبہ کی انتظامی حلقوں میں منقسم تھا۔ جن میں سرکاری عمل دخل کی طرح کی مشکلات پیدا کرنے کا سبب تھا۔ باری کی ٹیک کوشاہراہ ریشم پر سے گزرتے ہوئے ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مزارانہ اور ٹانگوز بستی کے درمیان تین الگ الگ خطے قائم کر دیے گئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کا سربراہ المغیور تھا۔ لیکن اہم انتظامی مناصب پر چینی فائز تھے۔ پارٹی پالیسی اور فوج انہی کے زیر اشرفتھی۔ ٹانگوز بستی بوتیان کے میسر نے ہماری تواضع کی لیکن سارے بانوں کے معاملے میں طرح طرح کی مشکلات کھڑی کیں۔ پارٹی کے دو افسر ہماری سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے پر مامور تھے۔ تمام اطلاعات اپنی کو بھجوائے۔ جہاں سے وہ بیجنگ بھیج دی جاتیں۔ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ہمارا رویہ ”جو ہو، سو ہو“ کا تھا لیکن باری کی ٹیک کش مکش میں بتلا تھی۔ ہم غیر ملکی تھے اور ایک بے حد حساس فوجی علاقے سے غیر ملکی فوجی گزر رہے تھے۔ ایسے میں صوبائی اور مقامی حکام کا تشویش میں بتلا ہونا اور ہماری حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا قابل فہم تھا۔

کریم یونس ہمارا لاری ڈرائیور جو سارے بان بن گیا تھا، علاقے کے تضاد کی

ایک اچھی مثال تھا۔ وہ باعمل مسلمان تھا۔ انہیوں تھا۔ وہ نیلی پتلوں پہنتا تھا۔ اس کا چہرہ منگلوں جیسا زرد تھا لیکن گال سرخ تھے۔ اس کے خدوخال یورپی یا ترک تھے۔ وہ جھینی بولتا تھا لیکن ہماری ٹیم میں شامل چینیوں سے اس نے چینی میں بہت کم گفتگو کی۔ وہ انہیوں تھا۔ جس کا وہ اظہار کرتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ لاری ڈرائیور تھا تو اس نے پیپلز لبریشن آری میں چار سال تک سپاہی کے طور پر کام کیا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ جب چینی، خاص طور پر زانگ بولم، انہیوں سے سختی سے پیش آتے تو اس کا رویہ کیوں بدل جاتا اور اس میں یعنی کا عصر کیوں آ جاتا۔ 37 سالہ کریم چینیوں کے رویے کے خلاف بغاوت کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتا۔

میں انہیوں کے رویے سے بہت متاثر تھا۔ ان کی ضرورتیں کم اور رویہ شریفانہ تھا۔ وہ راضی بہ رضا رہنے والے تھے۔ صحرائی مہم شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو مارکیٹ میں چھوڑ دیا۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ جس مہم میں شرکت کر رہے ہیں اس میں انہیں کیا حاصل ہو گا۔ وہ کب صحرائی کو عبور کر پائیں گے اور صحرائی سے بال بچوں سے پیغام رسانی کی کیا صورت ہو گی۔ کم سے کم ہم انگریز اور چینی جانتے تھے کہ ہم نے اپنے سے کہیں زیادہ بڑا کام اپنے سر لے لیا ہے اور یہ کہ دنیا اس میں دلچسپی لے رہی ہے اور ہماری پیش رفت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ باری کی ٹیم لندن اور بیچنگ سے خبریں لینے اور انہیں خبریں بھیجنے کی ذمہ دار تھی۔ کبھی کبھی صحرائی کو عبور کرنے والی ٹیم سیپلائز کے ذریعے برطانوی پریس سے رابطہ کرتی چنانچہ ہمارے خاندانوں کا ہم سے تعلق قائم رہتا۔ انہیوں کا معاملہ الگ تھا۔ ان کا اپنے الی خاندان سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ مہم ختم ہونے اور ان کے واپس گھروں میں پہنچنے پر ہی وہ ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں جان سکتے تھے۔ عیسیٰ بولتا کیوں کہ پہلے واپس چلا گیا تھا، مزاہت اغ تک پہنچنے سے قبل ریت کے میلے عبور کرتے وقت جوزہ رہ گداز حالات پیش آتے رہے، وہ انہی کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ جس سے سننے والے مطمئن ہونے کی بجائے، خوف اور سراسیگی کا شکار ہو جاتے اور جو لوگ ابھی صحرائی میں مہم جوئی میں مصروف تھے ان کے خیر کے ساتھ واپس آنے کی تمنا کرتے۔

انہیوں کے پاس سہولت کی بہت کم چیزیں تھیں۔ ہر انہیوں کے پاس ایک جوڑا

کپڑے جو اس نے پہن رکھے ہوتے اس کے علاوہ ایک لمبا کوٹ اور بس۔ کاشغر میں برطانوی قونصلیٹ کی لیڈی میکارٹنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ”کاشغر کے رینے والے مرد اور عورتیں لمبی آستینیں پہنتے ہیں، جو بالعموم ان کے ہاتھوں سے چھانچ لمبی ہوتی ہیں۔ انہیں کام کرنے کے لیے آستینیں موڑنا پڑتی ہیں، لمبی آستینیوں کے کافی استعمال ہیں۔ سرد موسم میں وہ مفلک کا کام دیتی ہیں۔ ان سے رومال کا، جھاڑن کا، نفرت کے اظہار کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ان سے ناک چھپالی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو ڈھانپ کر رکھنا، احترام کے اظہار کا بھی وسیلہ ہے۔ کسی بڑے آدمی کے ساتھ ہاتھ چھپا کر رکھنا ہی مجرز، انکسار کا اظہار ہے۔ کام پڑنے پر البتہ ہاتھ آستین سے نکال لیتے جاتے ہیں۔

المغیور کی ضرورتیں محدود، ان کے سوچنے کا انداز سادہ، ان کی امیدیں اور توقعات مختصر اور ان کی زندگی وقت کے دباؤ اور جدید دور کی سہولتوں سے آزاد ہے۔ چند ہفتے صحرائیں گزارنے کے بعد ہم نے غیر ارادی طور پر ان کے طرز زندگی سے سیکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم دوہرائے چلنے کے عادی ہونے لگے ہیں۔ عام حالات میں ہم کیسانیت کا کم ہی شکار ہوتے ہیں۔ حادثات اور معمولات میں ہر روز تبدیلی کے لیے کوشش رہتے ہیں۔ لیکن قدرت کے قریب تر آنے سے ہم نے بقا کا راز معلوم کر لیا۔ بہر حال اس سب کچھ سے لطف انداز ہونے کے لیے المغیور ہونا ضروری ہے۔ المغیور روپرٹ کی کھانے پینے کی عادت پر ہنسا کرتے۔ شام کے کھانے کے لیے روپرٹ اپنا بڑا بیلا تھر ماس نکالتا، ہم سب سے دو گناہاتا، المغیور اسے لوٹو لیتی اونٹ کہتے اور اس کی خوش خواری کی پرہنٹے۔ ان کے ہنسنے پر ہمیں بھی ہنسی آ جاتی۔

ٹانگو بستی سے روانہ ہوتے وقت میں سلیمان اور عبدال کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارے چار اوٹوں کے سارے باباں تھے۔ چینی خاتون فٹو گرافر پیچھے رہ گئی۔ پال ہمارے ساتھ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ موسم کے شدید سرد ہونے سے پہلے وہ جتنے بھی خاکے بنائے گے۔ کیتھ ہمارے ساتھ جانے کا خواہش مند تھا لیکن وہ پاول خواستہ اگلے پڑاؤ کے بعد واپس جانے پر تیار ہو گیا۔ پارنی اور میں نے یا وائے گرز کے شمال کی جانب چلنے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایسے علاقے میں داخل

ہوئے جس کے بارے میں، دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہت کم جانتے تھے۔ اونٹوں پر سامان لا دیا گیا تو امدادی ٹیم کو الوداع کہنے کا وقت آ گیا۔ میں نے بارنی سے مصافر کیا تو میرا بھی بھرا آیا۔ آگے کیا پیش آئے گا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بارنی کے ساتھ مجھے تحفظ کا احساس رہا تھا۔ وہ میری پریشانیوں کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کرتا آیا تھا۔ اس سے دوستی اور مفاہمت میرے لیے طاقت کا وسیلہ رہی تھی۔ بارنی کے جذبات بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوں گے۔ امدادی ٹیم میں شامل چینیوں سے معاملات طے کرنے اور جنوبی شاہراہ ریشم پر پارٹی کے ارکان سے منشے میں اس پر جو دباؤ آتے رہے، میں ان سے باخبر تھا۔ پھر جان تھامس بھی اس کے لیے طرح طرح کے مسائل کا موجب رہا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے روادر نہیں تھے۔ اس کھنپاؤ کے باعث بارنی کی حس مزاح ماند پڑی رہی۔ جان کا اپنا انداز فگر تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ چینیوں سے کام لیتا نامکن ہے۔ وہ سودا بازی کا قائل نہیں تھا وہ اس حقیقت سے نابلد تھا کہ کئی مہمات طویل عرصے تک برداشت اور مفاہمت کے طفیل ہی کامیابی سے ہم کنار ہوا کرتی ہیں۔ اس کے لیے طے شدہ منصوبوں سے اخراج بھی کرنا پڑتا ہے۔ جان کو صحراء میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی خیال نہیں تھا۔ اسے کبھی یہ دعویٰ کرتے ہوئے بھی تردد نہیں ہوتا تھا کہ اس کی گاڑیاں صحراء کو سیدھا عبور کرتی گزر سکتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ صحراء کے بعض حصوں سے گزرنے کا تجربہ رکھتا تھا لیکن اس کا تجربہ، مہارت اور اس کی گاڑیوں کی فنی صلاحیت کا مکلا مکان میں جو امتحان ہونے والا تھا، وہ اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس صحراء سے صرف انسان اور سامان سے لدے ہوئے جانور ہی گزر سکتے ہیں۔

بارنی کا کردار میری نسبت زیادہ مشکل تھا۔ اونٹوں پر مشتمل ٹیم کا واحد مقصد صحراء عبور کرنا تھا، اس کے سوا انہیں کسی اور کام سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ ہر گھنٹے، ہر میل اور ہر قدم ہمیں ہماری آخری منزل کے قریب تر کرنے کا وسیلہ تھا۔ منزل کی حیثیت ایک روشن ستارے کی تھی، جس نے ہمارے شب دروز کو روشن کر رکھا تھا۔ بارنی کی ٹیم سامان کی فراہمی کے لیے لمبے عرصے تک انتظار کرنے کی پابند تھی جب کہ چینی

شاہراہ ریشم کے قصبوں کے ہوٹلوں میں بیٹھے رہنے ہی میں خوش تھے۔ انہیں نئے تجربات سے گزرنے کی چند اخواہش ہی نہیں تھی۔

ہم نے 16 اکتوبر کو ٹانگوز بستی میں بکریوں کے چوداہوں اور ان کے گھر والوں سے رخصت لی اور بھاری سامان سے لدے ہوئے اونٹ لے کر اگلی منزل کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک صاف شفاف صبح تھی، پانی کی ٹینکیوں میں برف بھری تھی۔ ایک بار پھر سفر پر روانہ ہونا بہت بھلا لگا۔ میرے گھٹنے کا درد بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔ ہم نے تین ہفتوں میں 300 میل سفر کیا تھا۔ اب 500 میل کا طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

پہلے دن پال زیادہ وقت میرے ساتھ رہا، مجھے اس سے باتیں کر کے خوشی ہوئی۔ صحراء کا منظر بھی خوش کن تھا۔ جو چیز میری توجہ کا مرکز رہی، وہ خزان کی زردی اور پاپولر درختوں کی سرخی تھی۔ ہم دریا کی وادی سے گزر رہے تھے اور ریت کے ٹیلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے دو پرندے بھی نظر آئے اور میں نے گھر کے باغوں میں چھپھانے والے پرندوں کا خیال کیا۔ چینی ترکستان کے کونے میں اونٹوں کو لیے، درختوں کے تنوں اور ٹھٹھوں میں سے گزرتے اور نیلے آسمان کا نظارہ کرتے ہوئے مقصدیت کے گھرے احساس کے ساتھ چلتے رہے۔ میں نے پال سے کہا کہ میں مستقبل میں کسی بھی وقت ہپشاڑ کے جنگلوں میں چل سکتا ہوں، لیکن ان درختوں میں سے اونٹوں کا کارروان لے کر چل سکوں گا؟ اس نے جواب دیا ”موت کے بدنام صحراء“ کو اس کے حال پر رہنے دو۔ میں نے سوچا کہ یادا ٹانگوز چیخنے میں ہمیں پندرہ دن لگیں گے۔ میرا ارادہ تھا کہ راستے میں ”نیا“ کے قدیم آثار ضرور دیکھوں گا، اس کے لیے اپنی ٹیم پر اضافی بوجھڈا لانا ہوگا۔ ہمارے پاس پندرہ دنوں ہی کے لیے راشن اور پانی تھا اور ابھی کئی ہفتوں کا سفر باقی تھا۔ اس میں پال اور سارے بانوں کی ضرورت بھی پوری کرنا تھی۔ اونٹوں پر اب پہلے کی نسبت زیادہ بوجھ لدا ہوا تھا۔ سردیوں کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے ہمیں گرم کپڑے اور خیمے لکانے پڑے۔ ناک کی سیدھ چلتے رہنے سے ”نیا“ کے آغاز تک چیخنے کے امکانات بھی کم تھے۔ ہمیں اس قدیم بستی کے آثار تلاش کرنے میں دو روز لگ سکتے ہیں۔ اس لیے براۓ نام غلطی کرنے کی بھی گنجائش باقی تھا۔

نہیں۔ اس امر کی بھی خصائص نہیں کہ پارنی رسد کی بہم رسانی کے لیے کوئی موزوں مقام تلاش کر سکے گا۔ ”نیا“ تک پہنچنے کے لیے اونٹوں والی ٹیم کو صحراء میں سیدھا جانے کی بجائے تکون کے دونوں جانب سے چلنے کے لیے کہنا پڑے گا۔ مجھے امید تھی کہ زیادہ فاصلہ طے کرنے سے ممکن ہے کہ ہم ”نیا“ تک پہنچ سکیں۔

17 اکتوبر کو اتوار کے روز ناٹگوز سے نکلے ہوئے دو دن ہونے کو آئے تھے۔

ہم پر ایک تباہ کن اکشاف ہوا، ہم جو پانی گاؤں سے یہ سمجھ کر لائے تھے کہ میٹھا ہے، نہیں نکلنا۔ وہ انسانی استعمال کے قابل نہیں تھا۔ اس شام کیرولین اور مارک نے کنٹیز اور بجیری کیں سے پانی چکھا۔ مزار تاغ سے جو پانی لائے تھے اس میں سے صرف 100 لتر پینے کے قابل تھا۔ اور اسے چودہ افراد کے لیے پدرہ روز تک استعمال ہونا تھا۔ واپس جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ گاؤں جہاں سے پانی لائے تھے، اس کے کنوئیں نہیں نہیں ثابت ہوئے تھے۔ اس لیے کسی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ چرواحوں کے خاندان یا تو کڑوا پانی پینے کے عادی تھے یا وہ پینے کے قابل بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ خوش قسمتی سے نہیں پانی کھانا تیار کرنے کے لیے موزوں ثابت ہوا۔ ساربان بھی اسے بخوبی پی سکتے تھے۔ ظاہر تھا کہ صاف پانی کی جو مقدار میسر تھی، وہ بربطاں اور چینی ارکان کو باہم تقسیم کرنا ہوگی۔ جن کنٹیزوں میں میٹھا پانی تھا ان پر ہم نے نشان لگادیے۔ میں نے یہ ہدایت کی کہ روزانہ صرف ایک لتر صاف پانی، پینے کے لیے لیا جاسکے گا۔ باقی کا نہیں پانی حسب ضرورت لیا جاسکے گا۔ اس طرح صاف پانی ہماری نو دن کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ اس کے بغیر اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہنگامی صورت حال میں نہیں پانی لیا جا سکتا ہے۔ اس کا مزہ بد لئے کے لیے اس میں اور نہ پاؤڑ رملایا جا سکتا ہے لیکن اس سے پیاس بخنکی بجائے تیز ہو جائے گی۔ روپرٹ نے کہا کہ میں نہیں پانی پی سکتا ہوں، اس لیے اچھا پانی پینے والوں میں اسے شمار نہ کیا جائے۔ مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے ہماری بقا کے امکانات میں ڈرامائی کی آئے گی۔ کیرولین نے کہا کہ بچت کی ایک ہی صورت ہے کہ موسم پدل رہا ہے۔ ہم پہلے ہی کم پانی پینے لگے ہیں۔ اب مزید بچت کر سکیں گے۔ کیرولین کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کبھی مشتعل کر دیتی تھیں اور بات بڑھ بھی جایا کرتی تھی۔ کیرولین

صحح کو عموماً خاموش رہا کرتی۔ اس کے برعکس روپرٹ بڑا زندہ دل تھا، ترکی پر ترکی جواب دینا اس کی عادت تھی، اسے کام کر کے سکون ملتا۔ اس کی طاقت اور توانائی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک صحح وہ ریت سے اٹھا اور اس نے کیرولین کو کمر سے کپڑا لیا اور کہا کہ آؤ، کچھ پیار و محبت کی بات کر لیں۔ روپرٹ نے اگر 25 دن ہر صحح ہبھی بات نہ کہی ہوتی تو اسے مذاق سمجھ کر ثالا جا سکتا تھا۔ کیرولین نے اس کے سر پر تھپٹر مارتے ہوئے کہا ”بدمعاش کہیں کا، پرے ہٹ سور،“ روپرٹ پرے ہٹ گیا، اس نے آئندہ ہفت کے دوران میں کیرولین کو نظر انداز کیے رکھا۔ ان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ میں نے ان میں صلح کرانا چاہی لیکن روپرٹ نے فاصلہ برقرار رکھا۔ اس ایک واقعہ نے اسے خوب میں بند کر دیا۔ اس نے مارک کے سوا سب سے کلام کرنا چھوڑ دیا۔ جو بات بھی کرنا چاہتا، مارک کر لیتا۔ روپرٹ نے ٹیم میں پال کی شمولیت کا خیر مقدم نہیں کیا تھا۔ اس نے اس کا واضح اظہار تو نہیں کیا تھا لیکن اس نے اس کے لیے جو تحفظات قائم کر لیے تھے سب انہیں محسوس کر سکتے تھے۔ روز مرہ کے معمولات بجائے خود ہماری مشکل کا سبب تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ صراحتاً کو عبور کرنے کی غرض سے صرف چلتے رہے ہیں۔ کوئی اور کام ہم نے نہیں کیا۔ اونٹ، چلی اور المخیور ہی ہماری متاع تھے۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے گرد ایک حفاظتی دیوار کھڑی کر لی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہماری اور اونٹوں کی بقا کے بارے میں شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔ میں نے کیرولین اور مارک نے پال کی طبیعت کی تازگی محسوس کی۔ اس کے مشاہدات چیزوں کو مختلف انداز سے دیکھنے اور سمجھنے کا وسیلہ بنے۔ لیکن کیوں کہ وہ روپرٹ کی فوجی حس مزاج کو پسند نہیں کرتا تھا وہ اپنے گرد و پیش میں فن کارانہ دلچسپی لیتا رہا۔ روپرٹ کو اس میں بھی اس سے کوئی اتفاق نہیں تھا۔ میں نے ایک شام اس کی ناراضی کا بین اظہار محسوس کیا۔ ہم شمال مشرقی سمت سے چلنے والی تیز ہوا کے خلاف اونچے ریتلے ٹیلوں میں سے گزرتے تھک کر چور ہو گئے تھے۔ کئی اونٹوں پر سے سامان ڈھلک کر گر گیا تھا۔ اونٹوں کو آپس میں باندھ کر رکھنے والے رے ٹوٹ گئے تھے۔ اس دن نے ہمیں بد مزاج بنا دیا تھا اور ایک ہی طرح حالات اور مسائل کا سامنا کرتے کرتے ہم بے حال ہو گئے تھے۔ اس روز ہم سات میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ اس ست رفتاری نے

ہماری پریشانی بڑھا دی۔ ہم رہا سہا فاصلہ جلدی طے کرنا چاہتے تھے۔ ابتدا سے جن مشکلات اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ تو گزر گئے۔ اب ماحول ہمارے لیے اجنبی نہیں تھا۔ مشکلوں کی شدت بھی ہم دیکھے چکے تھے۔ ٹیم اب بڑی حد تک آسودہ ہو گئی تھی۔ ہر روز ایک سے معمولات، اونٹوں پر سامان لادنا، اتنا رنا انہیں ٹیلوں پر سے گزارنا، ریت میں رہنا، ریت کھانا، المپیور اور چینیوں کی بچگانہ حرکات سے نہنڈا، اس کے سوا اور کچھ بھی کرنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ شام ہوئی تو مارک اور یوپرٹ نے ریڈ یو پر باری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ کیرولین زخمی اونٹوں کی دیکھ بھال میں لگ گئی، پال ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھا منظر کشی میں مصرد رہا۔

ایک اونٹی سخت بیمار تھی، کیرولین نے اسے صاف کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی دوائیں بھی اونٹوں کو کھلا رہے ہیں۔ ہمارے اپنے لیے نہ بھیں تو کیا کریں گے؟ اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سارباں اپنے اونٹوں سے لاتعلق تھے، ان کا روایہ ہمارے لیے پریشانی کا موجب تھا۔ یوپرٹ اور میں اونٹوں پر سامان ادلتے بدلتے رہتے، جو مضبوط اونٹ تھے ان پر بھاری سامان لادتے، جو کمزور اور بیمار تھے انہیں سہولت فراہم کرتے تاکہ ان کی طبیعت سنجل سکے۔ شام کو ہم نے اونٹوں کی حالت کی بناء پر جو کچھ مناسب سمجھا کیا، کیرولین زخمی اونٹوں کو دوا دارو دیتی رہی۔ شام ہوئی تو ایک دوسرا مشکل اور صبر آزمہ کام، پانی کے لیے کنوں کھودنے کا تھا۔ بیماری، بھوک اور پیاس نے اونٹوں کو لا غر کر دیا تھا۔ ان کے کوہاں کی چربی پکھل گئی تھی۔ جس کے سبب سے سامان انہیں چھینے لگا تھا۔

سلیمان نے ساربانوں کو اونٹوں کے لیے گدیوں میں کاہی وغیرہ بھرنے پر لگایا تاکہ ہڈیوں پر براہ راست بوجھنے پڑے، اس سے سامان لادنے میں زیادہ وقت لگے گا۔ لاوزہاؤ واحد شخص تھا جس نے اپنے آپ کو تمام معاملات سے الگ تھلگ اور لاتعلق رکھا۔ جن اونٹوں پر سامان نہیں لادا جاتا تھا، لاوزہاؤ ان پر سواری کرتا۔ مارک کی لاوزہاؤ سے گاڑھی چھنتی تھی، وہ ایک دوسرے کو قصے کہانیاں سناتے رہتے۔ مارک سے باٹیں کرنا اور چینی زبان اور عوام سے اس کی محبت میرے لیے خوشی کا موجب ہیں۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ فوج چھوڑنے کے بعد کیا کرو گے؟ اس کا جواب تھا

کہ چین میں کام کروں گا۔ میں نے کہا کہ تم یہاں اپنی روح کو تباہ کرلو گے۔ اس نے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نفرت بھی تو کش کا موجب ہوا کرتی ہے۔ شاید بھی وجہ ہے کہ چینی لوگ اور ان کی زبان مجھے پسند ہے۔

ایک شام کھانے کے بعد ہم ریت پر بیٹھے تھے۔ آسمان پر ستارے چک رہے تھے اور چاند ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ مارک نے ہمیں ایک چینی کہانی سنائی۔ یہ ایک معمار سے متعلق تھی۔ وہ ایک پہاڑ کے نیچے ایک پتھر گھر رہا تھا۔ کام تھکا دینے والا تھا۔ اس کا معاوضہ بھی نہایت حیرتی تھا۔ ایک دن کام کرتے وقت اس نے سراہیا اور دیکھا کہ ایک گھر سوار سوداگر شہر کی جانب جا رہا ہے۔ معمار نے دل میں سوچا اور خواہش ظاہر کی کہ کاش وہ سوداگر ہوتا۔ اس کی دعا قبول ہو گئی اور وہ سوداگر بن گیا۔ وہ اس حیثیت میں شہر گیا۔ اس نے ایک خوش پوش افسر کو دیکھا جس کے آگے پیچے خواریوں کا ایک ٹولہ کھڑا تھا۔ انہوں نے اسے ایک پاکی میں بٹھایا اور اٹھا لے چلے۔ اس نے خواہش کی کہ وہ افسر ہوتا۔ دوسرے لمج وہ افسر بن گیا۔ اسے ایک لمبے اور تکلیف وہ راستے پر لے جایا جانے لگا۔ سورج نے اسے پاکی میں بھون ڈالا۔ اس نے خواہش کی کہ کاش میں سورج ہوتا، جو خلک سالی اور قحط لاتا اور تمام بڑے بڑے افسروں کو گرم کرتا اور انہیں بے چین اور بے آرام کرتا، وہ سورج بن گیا۔ وہ اپنی گرمی اور تمازت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا کہ ایک بادل اس کے راستے میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ کاش بادل بن کر وہ سورج کا راستہ روکتا، سیلاں لاتا، وہ بادل بن کر چلا تو راستے میں تیز ہوا چلنے لگی، جس نے بادل کو واڈا دیا۔ اس نے ہوا بننے کی خواہش کی، ہوا بننا اور ہوانے زور دکھانا چاہا تو پہاڑ نے اس کا راستہ روکا۔ تو اس نے کہا کہ پہاڑ بننا زیادہ بہتر ہے۔ پہاڑ بننا، تو کہنے لگا کہ اب کیا کروں؟ پہاڑ ایک جگہ جم گیا۔ ہوا بند ہو گئی تو پہاڑ سے ایک ہلکی سی آواز آنے لگی، جیسے کوئی پتھر گھر رہا ہو۔ ہوا تیز ہوئی تو پتھر گھرنے کی آواز بھی تیز ہو گئی۔ وہ نیچے دیکھتا ہے تو پہاڑ کے نیچے ایک معمار پتھر گھر رہا ہوتا ہے۔



باب 12

پانی کا بحران

ٹانگووزبستی سے نکلنے کے چار روز بعد 19 اکتوبر کو میں ایک ٹیلے پر کھڑا تھکن کے باعث ہانپ رہا تھا۔ ریت بہت نرم تھی اور میرے پاؤں میں تک اس میں ڈنس گئے تھے۔ ہوا بندھی اور درجہ حرارت 88 فارن ہائیٹ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دن ختم ہو اور رات بندھنی ہو جائے اور ریتلے ٹیلوں کے سمندر سے گزرتے گزرتے ہم پر جو تھکن طاری ہو گئی ہے، اس سے نجات مل جائے۔ میں پیاسا تھا۔ میری بول میں نمکین پانی تھا جس نے میری طبیعت اور زیادہ خراب کر دی تھی۔ وافر مقدار میں صاف میٹھے پانی کی خواہش بڑھ گئی تھی۔ مشکلوں پر قابو پانے سے جو اطمینان اور جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ محرومی کی لفی کر دیتی ہے۔ منہ سے ریت نکالنے کے لیے میں نے تھوکا، لیکن ریت میرے دانتوں پر جنم گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جب ہم اپنی مہم ختم کر لیں گے تو دانتوں کا سارا انیمیل اتر گیا ہو گا۔ میں نے دوبارہ تھوکنا چاہا، لیکن منہ میں تھوک ہی نہیں تھا۔ میری زبان تالو سے چھٹ گئی تھی۔

میں اب تک کی کامیابی پر خوش تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ”نیا“ کے قدیم آثار تک پہنچنے میں دو دن نجک جائیں گے۔ صحرائیں ضرورت سے زیادہ دیر رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہر روز ہمیں زندہ رہنے کے لیے جو جتن کرنے پڑتے ان کے پیش نظر آرام اور آسودگی کی جستجو کرتے رہنے کا پرانا خیال خام نظر آنے لگا۔ یہ تباہی لانے والے نادیدہ ہاتھ کے خلاف جدوجہد کرنے کے مترادف ہوتا اور ہمارا کارروائی جو اتنی تگ و دو کے

بعد یہاں تک پہنچا تھا، اس ہاتھ کی گرفت میں آ جاتا۔ میں نے اپنی چھڑی سے ریت کی دبازت جانتا چاہی۔ چھڑی ایک فٹ اندر چلی گئی۔ مزید دباؤ سے وہ اور آگے جا سکتی تھی، میں نے اپنا ہیئت اتار کر اس پر رکھ دیا، جس سے مجھے یاد آیا کہ میدان جنگ میں جہاں کوئی سپاہی کھیت رہتا ہے، وہاں اس کے ساتھی اس کی یاد کے طور پر اس طرح کا نشان بناتے ہیں۔ گرم ریت پر بیٹھ کر میں نے اپنے بوٹ اتارے اور چھالوں کو ہوا لگائی۔ پاؤں پسینے اور ریت سے اٹے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ دیر نگئے پاؤں چلنا چاہا، میرے پاؤں سوچے ہوئے تھے۔ ان کی ایڑیاں اور انگلیاں زخمی تھیں اور ان پر ریت کی تہہ جنم گئی تھی۔ جس صورت حال سے ہم دوچار تھے، اس میں بے یار و مددگار ہونے کا احساس فروں ہو جایا کرتا ہے۔ ہم ہر روز ریت کے ٹیلوں پر چلتے، ایک ہی طرح کا سپاٹ اور بے رنگ منظر دیکھتے، اونٹوں کو بکھرنے سے روکنے کے معمول میں مصروف رہتے رہتے تنگ آ گئے تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ جو کنوں کھودیں گے اس سے پانی مل جائے گا۔ ہم کیسے بے خطر اور بہادر لوگ تھے؟

نیلے آسمان کے پس منظر میں ریت کے زردی مائل سفید رنگ ٹیلوں کی اطراف کی چوٹیوں تک اٹھتی ہوئی لاٹیں اور ان کے درمیان گہرے کھڈ، جن میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا گیا تھا، میں ان کے نظارے میں کھو گیا تھا۔ مجھ سے پہلے انہیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ دراصل میں ہی ان کا فاتح تھا۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی ریت کو سب سے پہلے میرے ہی پاؤں نے چھوڑا تھا۔ صمرا کی خوبصورتی مجھے لبھاتی رہتی ہے۔ کمی بار ایسا بھی ہوا کہ میں اپنی ہر طرح کی تشویش بھول گیا۔ کارروان کے آگے ہونے کے حوالے سے میں اپنی دنیا میں چلا جاتا رہا ہوں۔ خاموشی مجھ پر جملہ آور تھی۔ نہ پہلے، نہ اب خالی و سعتوں میں اس قسم کی خاموشی کا مجھے تجربہ ہوا تھا اور نہ کبھی آئندہ ہو گا۔ میں اپنی زندگی میں ایسی تہائی اور امن کی پھر کبھی امید نہیں کر سکوں گا۔

میں نے ریت سے اوپر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کوئی ہیولا نظر آیا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو واقعی ایک درخت تھا۔ میں نے آنکھیں جچکائیں اور سراب کے گزر جانے کا تھوڑی دیر انتظار کیا۔ آنکھیں کھولیں تو بلند و بالا درخت، زرد پتوں کی

uba پہنچ کھڑا تھا۔ جیسے ریت کی پہنچائی میں وہ پہرہ دے رہا ہو۔ اس کا گرد و پیش سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ مجرما تھا۔ یہ سوچ کر کہ میرے پیچھے آنے والے مجھ سے نہیں آ ملیں گے، میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ میں اس کے پاس پہنچا اور اس کے نیچے بیٹھنا چاہا، وہ ایک نہیں، دو درخت تھے۔ جو اپنی جڑیں چھوڑ کر، زمین پر گر پڑے تھے۔

میں جیسے ہی ان کے پاس پہنچا، کارروان کا پہلا اونٹ بھی آ گیا۔ میں نے تہائی کا جوتانا بانا بن رکھا تھا، ٹوٹ گیا۔ درخت میرا نہیں رہا تھا، سب کسی کا تھا، جس کے فوٹو اتارے گئے۔

درخت اس بات کی علامت تھے کہ آس پاس کہیں پانی ضرور ہے۔ پانی کی تلاش کرتے دوسرا دن ہو گیا تھا۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ پیاسے تھے۔

100 فٹ اونچے ٹیلوں میں سے گزرتے ہوئے ہم جہاں پہنچا اس کا منظر کسی کے لیے بھی خوش آئند نہیں تھا۔ ہمارے سامنے **800** فٹ بلند پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا، جسے عبور کرنے کے لیے اونٹوں کو مغربی جانب کے طویل دشوار گزار اور بل کھاتے ہوئے راستے پر ہاکنا پڑا۔ ہم کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں ہم پانی کی تلاش میں کنوں کھو دسکیں۔ کرتے کرتے ہم سب سے بلند جگہ پہنچ گئے۔ وہاں سے نیچے کی جانب دیکھا تو دو میل چوڑی، کم اونچے ٹیلوں کی ایک وادی نظر آئی۔ اس کے وسط میں درختوں کی ایک قطار نصف میل تک چلی گئی تھی۔ وہ شمال اور جنوب کے سرروں پر قدرے پھیلی ہوئی تھی۔ درمیان میں خاصی گھنی تھی۔

مارک نے کہا کہ لگتا ہے کہ یہ وادی قدیم زمانے میں گھنا جنگل تھی۔ پال بولا، یہ ممکن نہیں۔ ہر حال ایک ایسے صحراء میں جہاں پانی نہیں تھا، درختوں کی موجودگی غیر معمولی اور غیر متوقع بات تھی۔ اسے خفیہ محلتات بھی کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں یہاں قدیم آثار بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم سے پہلے کے سیاح شین اور ہیدن نے ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ لیکن وہ سیدھے راستوں پر چلتے رہے تھے، اس لیے یہ آثار ان کی رسائی سے باہر رہے۔ ہم نے بڑی توقعات کے ساتھ اونٹوں کو مشرق کی جانب کی ڈھلان سے نیچے اتارنا شروع کیا۔ ایک

گھنٹے کے بعد ہم جنگل کے سرے تک پہنچ گئے۔ سارے بان اونٹوں کو چکارتے رہے، لوئیں نے گانا شروع کرایا اور میں منظر کو حافظے میں سمیت لینے اور یاد رکھنے کی سعی کرنے لگا۔ اونٹوں کے پھنسنے سے ریت کے بادل اٹھنے لگے۔ کارروان کے سبھی لوگوں کی کوشش تھی کہ کسی اونٹ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، ان پر جو سامان لدا ہے، خاص طور پر پانی کے کنٹیز محفوظ رہیں۔ ہمارے سامنے دور فاصلے پر بھورے، سبز اور ہرے درخت تھے۔ ان کے پس منظر میں چھوٹے ٹیلوں کا ایک سلسلہ تھا، جسے دیکھ کر مصر کے اہرام یاد آتے۔ قدیم زمانے میں اس وادی سے دریا گزرتا ہوا۔ کبھی یہاں تکلا مکان کے شہر بھی ضرور ہوں گے۔ اونٹوں کے سارے بان پکارنے لگے، ”درخت، درخت۔“ ہم سب نے ایک زبان ہو کر کہا، ”الحمد للہ۔“ میں جو منظر دیکھ رہا تھا کیا وہ حقیقی ہے؟ میں نے اپنے آپ کو چکلی بھری۔ اگر دریا کے کنارے کبھی کوئی بستی تھی، تو وہ ہزار برس پہلے آباد ہوئی ہو گی۔ اس کے آثار کی دریافت ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہوتی۔ میں نے چاروں اطراف میں آدمی دوڑائے کہ بھیں پانی کے آثار دیکھیں تو بتائیں، لیکن بدقتی سے سب ناکام ہوئے۔ پانی کے لیے کنوئیں کھو دے گئے، جس سے ریت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہاں کبھی آتش فشاںی ہوئی ہو گی۔

”گیو جن والی پکارا،“ ہمیں کچھ لوگ دیکھ رہے ہیں۔“

میں نے پوچھا، ”کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہیں وہ آدمی جو تمہیں نظر آ رہے ہیں؟“

”ہم چینی لوگ اس طرح کی چیزیں محسوس کر سکتے ہیں۔ یہاں رو جیں ہیں جو ہمیں دیکھ رہی ہیں۔“

میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا، اس پر مزاج کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ نہایت سمجیدہ تھا۔

”مجھے آوازیں بھی آ رہی ہیں،“ اس نے کہا۔

شام ہو رہی تھی، میں نے گیو سے مشورہ کیا اور اگلی ریتلی چٹان تک سفر جاری رکھنے پر اتفاق کیا۔ ہم پانی کے لیے کنوں کھو دنا چاہتے تھے تاکہ دوسری صبح اونٹوں کو پانی پلاسٹیک۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ درختوں کے علاقے میں

قیام اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ میرا گھٹنا سوچ گیا تھا اور درد کرنے لگا تھا۔ مجھے بھی آرام کی ضرورت تھی لیکن میں نے کہا کہ ہمیں چلتے رہنا چاہیے، تاکہ کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں پانی تلاش کیا جا سکتا ہو۔ سارے باؤں نے اوتھوں کی مہاریں پکڑ لیں اور انہیں آگے چلنے کے لیے کھینچنے لگے۔ ان میں سے بعض اونٹ بلبلانے لگے۔ وہ بھی ہماری طرح تھکے ہوئے تھے۔ ہم نے درخت کے آخری متین کو پیچھے چھوڑا اور ریت پر آ گئے، جو ٹھنڈی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پانی نہ ملنے اور جنگل میں مدفنون کی رازوں کو معلوم نہ کر سکنے کا افسوس تو ہوا لیکن پانی کی تلاش میں ہم آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔ پانی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں ایک دن کے لیے وہاں ضرور قیام کرتا۔ پانی کی تلاش نے ہمیں ہر حال میں سفر جاری رکھنے پر مجبور کیا۔ جنگل میں ایک دن گزارتے تو پال جی بھر کر نقشہ کشی کرتا اور ہم وہاں کی بیاتات کا تجزیہ کر سکتے۔ کچھ نمونے اکٹھے کر سکتے۔ یہ وہ کام تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس رات پانی نہیں ملا۔ دوسرے دن بھی نہیں ملا۔ پانی نایاب تھا۔

20 اکتوبر کو میں نے ڈائری میں لکھا ہمیں ایک ہی پریشان کن مسئلہ درپیش ہے۔ ہمارے پاس صرف 375 لتر پانی رہ گیا ہے۔ اس میں سے صرف 70 لتر پانی آلو دہ نہیں۔ کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دے رہی جہاں سے پانی ملنے کا امکان ہو۔ دو دن ہو گئے ہیں کہ ریت کے ٹیلوں میں بھک رہے ہیں۔ بہاں قدیم جنگل ہے تو دوسری جانب لق و دق صحراء ہے جہاں پانی کی ایک بوند بھی نہیں۔ کیا جنگل محض واہمہ تھا یا حقیقت تھا؟ ہم نے آلو دہ پانی میں سے نصف اوتھوں کو پلا دیا۔ جہاں سے چھسات دن کی مسافت پر بواتون گوز ہے۔ وہاں سے پہلے پانی ملنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ جتنا کچھ صاف پانی میسر ہے اس پر اکتفا کرنا پڑے گی۔ ایک دن کے لیے ایک لتر پانی چاہیے ہوگا۔ اس لیے پانی کی سخت حفاظت کرنا ہوگی تاکہ اس کی معمولی مقدار بھی نہ بہنے پائے اور نہ بخارات بن کر اڑ سکے۔ اس دوران میں ”نیا“ کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔ تاکہ شاید وہاں پانی مل جائے۔ ”نیا“ تک پہنچنے میں ایک دن لگ سکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں جنوب کا رخ کرنا ہوگا۔ کتنی دور جانا پڑے گا؟ یہ واضح نہیں۔ مجھے شین کا سفر نامہ یاد آتا تھا، اس نے شاہرا و ریشم سے اوپر من فنگ سے

صحرا کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہ ایک قدیم دریا کے کنارے چل رہا تھا۔ دریا کی گودی کو خٹک ہوئے مدین گزر گئی تھیں، اب وہاں پانی کے آثار تک نہیں تھے۔ شین نے یہ دیکھ کر کہ یہاں پانی ملنا محال ہے، اپنے تمام اونٹ واپس بھیج دیے تھے۔ باری کی آواز بھی میرے کانوں میں آتی، ”شین کی بات کونہ بھلانا کہ ”نیا“ میں اسے پانی نہیں ملا تھا۔ تمہیں کہاں سے مل جائے گا؟“ صورت حال کی سُکنی کے احساس نے مجھے ہلاک رکھ دیا۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے، لیکن دونوں پر خطر یا وانا گوز کی طرف کا راستہ بہت بلند تھا، اس پر جانے سے پانی جلد ختم ہو جاتا۔ دوسرا چھکنزو راونٹوں کے مر جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اس طرح پانی کی تلاش میں جنوب کی طرف جانا بھی آسان نہیں تھا۔ پانی کے ملنے کا امکان بہت کم ہے۔ ”نیا“ کی تلاش میں نکلا اور اس کا راستہ ڈھونڈنا بے سود تھا۔ لیکن ”نیا“ کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں ہر ایک کی رائے جاننا چاہتا تھا تاکہ جو قدم بھی اٹھے، اتفاق رائے سے اٹھے۔ پانی کتنا رہ گیا ہے؟ اس کی بنا پر ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ مجھ سے دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک یہ کہ میں نے خیال کیا کہ ”نیا“ میں پانی موجود ہے۔ اگر میں نے شین کی تحقیق کا جائزہ لیا ہوتا جس طرح باری کی تلاش تو پہنچ چل جاتا کہ حقیقت کیا ہے۔ کیرولین نے کہا کہ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو ہمیں موت کی وادی کا منظر دکھائی دے گا۔ درختوں کے مردہ ٹھنڈھ اور تنے، جیسے قبرستان ہو۔ ہم دن میں جس میلے کے پاس سے گزرے، یہی گمان گزرا کہ یہاں کھو دیں تو پانی مل جائے گا۔ لیکن پورا علاقہ اتنا خٹک اور بے آب تھا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔

پال نے پوچھا، ”تمہاری دوسری غلطی کیا تھی؟“

”تین دن گزرے ہم پانی کے لیے کھدائی کر سکتے تھے، لیکن ہم نے نہیں کی۔ اس کا کوئی جواز نہیں تھا، دراصل اونٹوں کو نا گوز بستی میں خوب پانی پلا لیا تھا۔ وہ تازہ دم لگتے تھے، اسی لیے ہم نے پانی کی تلاش میں کوتاہی کی، جو ہم نے نہ کی ہوتی تو اونٹوں کو پینے کے لیے مزید پانی مل جاتا اور بڑی مقدار میں پانی ساتھ لے جاسکتے۔ یہ غلطی معمولی نہیں تھی، اسے جان لیوا کہہ سکتے ہیں۔ ہاں روپرٹ نے کہا تھا کہ ہمیں

پانی کے لیے کنوں کھو دیتا چاہیے، اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آگے کیا پیش آئے۔
میں نے اس کا مشورہ نہیں مانا۔“

کیرولین نے کہا ”چارلس! انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم اب تک خوش
قسمت رہے ہیں۔ اگر ہمیں احساس تحفظ ہو جاتا تو تھوڑتے پڑ جاتے۔ سہل انگاری ہم
سب کی غلطی ہے، ہم سب ایک ہی صفت میں کھڑے ہیں۔“

میں نے ہدایت کی کہ ہر فرد دن میں صرف ایک لتر پانی لے سکے گا۔ صحیح اور
شام کو کھانا پکانے کے لیے ایک لتر پانی استعمال ہو گا۔ اس طرح ہر دن اٹھائیں لتر پانی
ہمارے درمیان تقسیم ہوتا۔ ہمارا باقی ماندہ پانی اونٹوں کو پلایا جا سکتا تھا۔ روپرٹ اور
زاگ بوكا کو ہر ایک کی بولیں بھرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مقصد یہ کہ کوئی مقررہ
مقدار سے زیادہ پانی نہ لے سکے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ دباؤ اور بحران میں لوگوں کا
رویہ بدلتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر باہم جھگڑنے لگتے ہیں۔

اونٹوں کا اچھی حالت میں رکھنا ضروری تھا۔ مہم کی کامیابی کا انحصار اسی پر تھا
کہ اونٹ ضروری سامان اٹھانے کے قابل رہیں۔ انسانوں کا ذمہ داریاں بھانے کے
قابل رہنا بھی ضروری ہے، لیکن اونٹوں کا معاملہ بھی مختلف نہیں۔ اونٹوں کو لمبے وقفوں
سے پانی ملے تو ان کی گزر ہو جاتی ہے لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب انہیں زیادہ
کام نہ کرنا پڑے۔ جب ان سے زیادہ کام لیا جائے گا تو اسی نسبت سے انہیں زیادہ
پانی بھی پلایا جائے گا۔ جس قسم کے حالات تکلام مکان میں پیش آتے رہے ان میں
زیادہ ہوش مندی چاہیے تھی۔ اونٹوں کو ہر روز بھاری سامان اٹھانا پڑتا۔ ۹۰ فارن
ہائیٹ کی گرمی میں ٹیلوں کو عبور کرنا پڑتا تو ان پر کیا گزر تی ہو گی؟ اس کا باہمی قیاس کیا
جاسکتا ہے۔

ایک دن جب گرمی پورے شباب پر تھی، ہر کوئی بوكھالیا ہوا تھا، ہم ریت کے
اوپنے ٹیلوں میں سے گزر رہے تھے کہ دو اونٹ، جو مختلف قطاروں میں تھے، چوٹی پر
سے لڑکتے ہوئے نیچے جا گرے، وہ زور زور سے بلبلا رہے تھے۔ وہ کمزوری کا شکار
تھے، انہیں چکارنے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ لاکھ کوشش کی کہ وہ کسی طرح اٹھ کر کھڑے ہو
جائیں لیکن بے سود، وہ بے بسی کے عالم میں ہمیں اپنی نم بھوری آنکھوں سے دیکھتے

تھے۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر، بہت افسوس ہوا۔ جب وہ کسی طرح بھی کھڑے ہونے پر تیار نہیں ہوئے تو ان پر لدا ہوا سامان اتارا گیا اور مضبوط اونٹوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ کریم نے کہا کہ کل یہ اونٹ مر جائیں گے۔ اس کی آواز میں کسی قسم کی جاذبیت کا اظہار نہیں تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اونٹ جب ٹیلوں پر چڑھتے تو ان کی پچھلی ٹانکیں بربی طرح کا نیچی تھیں، وہ انہیں پھیلاتے تو توازن برقرارنہ رکھ سکتے۔ گر پڑتے اور مر جاتے۔

مجھے وار آفس کی 1908 کی مطبوعہ اونٹوں سے متعلق وہ کتاب یاد آئی جس میں لکھا تھا کہ اونٹ بلا کے صابر ہوتے ہیں، وہ تادیر بھوک پیاس برداشت کر سکتے ہیں۔ زخم آنے پر بھی بالعموم خاموش رہتے ہیں۔ مرتے دم تک ہمت نہیں ہارتے، مرنے کے لیے ہی گرتے ہیں۔

صورت حال کا دباؤ، مجھ پر اثر انداز ہونے لگا۔ میں اپنی غلطیوں پر نادم تھا اور ریتلے ٹیلوں میں سے گزرنے کی رفتار کے کم ہونے پر ناراض تھا۔ ٹیلے راستے میں حائل ہونے لگے۔ ہمیں ان کے گرد چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ میں سوچنے لگا کہ قدرت کی طرف سے کھڑی ہونے والی مشکلوں پر قابو پانے کا ہمیں کیا حق ہے؟ صحراء ہم پر کیوں مہربان ہوا اور ہر چند روز بعد ہمیں پانی کی تلاش میں آسانی کیوں فراہم کرے؟ صحرائیمرے منصوبے کے کمزور ترین پہلو پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

میں نے مارک اور ریوپرٹ کو ایک بہت گھرے نشیب کے کناروں پر دیکھا، آدھا کارروان ان کے راستے پر چل رہا تھا۔ آدھا مجھ سے نصف میل پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے انہیں زور سے پکارا اور کہا کہ اگر تم دونوں اپنے اپنے راستے پر چلتے رہے تو کارروان بے سستی کا شکار ہو جائے گا۔ کس کے پیچھے چلے؟ وہ فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ ان کی لائقی نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ میری طرف آئیں۔ ان سے تین کلامی کا مجھ پر اچھا اثر ہوا، مجھے اطمینان حاصل ہو گیا۔



باب 13

قدیم آثار کا انکشاف

21- اکتوبر کو میں کمپ سے صحیح ہی نکل کھڑا ہوا اور اکیلا چلتا ہوا ایک فاصلے تک پہنچا۔ میں مکمل تہائی کا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے شین کے نقش سے اندازہ لگایا تھا کہ ہم ”نیا“ کے کھنڈروں کے شال مغربی کونے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ درختوں کے تنوں کے درمیان کسی قدیم عمارت کی باقیات ملنے کا امکان ہے۔ میں پندرہ سے تیس فٹ اوپر خیلیوں پر سے گزرتا جا رہا تھا۔ میں گئی رات کو کیے جانے والے فیملے پر غور کر رہا تھا۔ باری سے ریڈ یو پر رابطہ ہونے پر ہم اس نتیجے پر پہنچ کہ اس نے صحیح پیش بینی نہیں کی تھی کہ ہمیں ایک مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم مشرق کی طرف جائیں یا جنوب کی طرف، ہمیں خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا، اس نے اپنی گاڑیوں کو خطرے میں ڈال کر ہم تک جھینچنے کا فیصلہ کیا۔ ضرورت سے زائد تمام چیزیں، گاڑیوں پر سے بوجھ کرنے کے لیے اتار دی گئیں۔ 150 لتر پانی رہنے دیا گیا کیوں اس پر ہماری بقا کا انحصار تھا۔ ہم نے جو اکھیلے کا فیصلہ کیا۔ اونٹوں والی پارٹی جہاں تک ممکن ہوا، جنوب کی طرف بڑھے گی جب کہ باری شال کی جانب جائے گا۔ اگر کوئی گاڑی ریت میں پھنس گئی اور اسے نکالنا جاسکا تو ہم ناکاہی سے دوچار ہو جائے گی۔ ہم وقت ضائع کرنے کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اور نہ پانی کا ضیاء برداشت کر سکتے تھے۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ یعنی 15-7 کا وقت تھا۔ میں نے اپنی ڈائری نکالی اور لکھا: ”میں ’نیا‘ کے آثار کی تلاش میں ہوں۔ میرے سامنے حیران کن منظر ہے۔“

مشرق میں دور تک کم بلندی کے ٹیلے ہیں، افق پر اونچے ٹیلے چھپے ہوئے تھے۔ سورج کی روشنی میں ان کے سامنے دراز ہوتے جا رہے ہیں۔ مغرب کی جانب، جہاں ہم نے کیپ قائم کیا تھا، سورج نے مسخ شدہ درختوں کے تنول کو زیادہ بدہیت بنادیا ہے۔ جنہیں دیکھ کر یہ تاثرا بھرتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہاں کا جنگل تباہ ہو گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ ”نیا“ کے آثار مل جائیں لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے چاہا کہ سرا یورل شین کی روح پکارے، ”آؤ، مجھے بتاؤ کہ تمہیں آثار کہاں ملے ہیں۔“

ریت کی وسعت میں ”نیا“ کے نوازدہ پڑے ہیں جنہیں شین نے 1907ء میں ڈھونڈ نکلا تھا۔ اسے یہاں چوبی مہین ملی تھیں جن پر کچھ تحریریں کنہہ تھیں۔ انہیں پڑھ لیا گیا تھا۔ جس زبان میں یہ تحریریں تھیں وہ شاہراہ ریشم کے شمال مشرقی علاقے میں بولی جانے لگی ہے۔

سورج بلند ہو چکا تھا، دھوپ میں منظر کے سارے رنگ ڈھل گئے تھے۔ میں جب واپس کیپ پہنچا تو ادنوں پر سامان لادا جا چکا تھا۔ اونٹ سخت تھکے ہوئے، بے کل اور پیاسے تھے۔ وہ اپنے پاؤں بے چینی سے پٹخ رہے تھے۔ ہر اونٹ پر معمولی مقدار میں پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ ہم اس امید میں چل پڑے کہ بارفی ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں ڈرتا تھا کہ دونوں ٹیکیں ایک دوسرے کو جالینے کی بجائے کہیں کھونہ جائیں۔ گرمی بڑھ گئی تھی، پسینہ روئیں روئیں سے پھوٹ بہہ رہا تھا۔ پیاس سے برا حال تھا لیکن اپنی بوتل سے پانی دوپہر تک نہ پینے کا جو عہد کر رکھا تھا، اس پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ پیاس کی شدت ناقابل برداشت ہو گئی تھی، کیرولین نے اسے موت کی وادی کہا تو غلط نہیں کہا، لوکا ہر تھیڑا جیسے تباہی کا پیامبر ہو۔ لیکن نے اس صبح گیت نہیں گایا، جب وہ گانا بھول گیا تھا تو کوئی سارا بان کیسے گا سکتا تھا؟ ہم تھکن اور غشی کی درمیانی سرحد پر پہنچے ہوئے تھے، نامعلوم رستوں پر چند سو میل اور چلنے کا امکان ختم ہوتا دکھائی دینے لگا تھا۔ ہر ایک کوئی امید تھی کہ بارفی سے ملنے سے ہنگامی صورت حال سے نکلا جائے گا۔

میں سب سے ایک میل آگے ایک طرف ہو کر چل رہا تھا۔ خیال تھا کہ شاید اسی طرح قدیم عمارتوں کے آثار دکھائی دے جائیں۔ ایک جگہ میں ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا میں نے دیکھا کہ روپوٹ کی سربراہی میں کارروان ٹیلوں کے درمیان سے

گزرتا آ رہا ہے۔ جل اور سوکھے ہوئے درختوں کے تن چمگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ کارروان کے اوٹ اور افراد مجھے بے حد چھوٹے چھوٹے لگے۔ میں نے ریڈ یو پر باری کی آواز سنی، ہم نے ایک دوسرے کو بتایا کہ ہم کس جگہ پر ہیں، بیان رسائی کے ذریعے طے پایا کہ وادی کے دونوں اطراف کے پہاڑوں سے اتر کر ہم ایک دوسرے سے کہاں مل سکتے ہیں اور گاڑیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ کرشن نے ریڈ یو پر بتایا کہ ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ کیا آپ بھی ہمیں دیکھ سکتے ہیں؟ کرشن کو باری کی نے دور بین دے کر بھیجا تھا کہ دیکھے کہ ہم کہاں ہیں۔ وادی گرم تھی، ہوا الکل بند تھی۔ دھوپ میں ریت کی چمک آنکھوں کو چند صاریحی تھی، کالا چشمہ پہن کر ہی تمحی طرح دیکھا جاسکتا تھا۔ ہم چلتے گئے، خیال تھا دونوں یہیں آپس میں آ ملیں گی۔ روپرٹ مارک اور میں، اوٹوں سے بہت آگے چل رہے تھے۔

اچانک وہ نظر آ گئے۔ گاڑیاں چھوٹے کھلونے کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہماری طرف آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ اینی تھی، جو لوٹی ہوئی بوتوں کا تجھہ لا لائی تھی۔ مارک اور روپرٹ بیک زبان پکارے۔ ”اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔“ ہم ایک گھنٹا امداوی ٹیم کے ساتھ رہے۔ وادی گری سے ہمیں بھون رہی تھی۔ میری پہلی چاہت یہ تھی کہ گاڑی کی اوٹ میں پیٹھ کر کچھ دیرستا سکوں۔ ہم نے ”نیا“ کی تلاش میں شمال مشرقی سمت اختیار کی۔ اونچائی سے باری کی ٹیم نظر آئی۔ ایک گاڑی پر یو نین جیک لہرا رہا تھا۔ امدادی ٹیم جو صاف پانی جیری کیں میں بھر کر لائی تھی، ہم نے بے دھیانی میں اپنے کنسٹروں میں بھر لیا۔ جو پانی ہمارے پاس تھا، اس کا نصف ہم نے اوٹوں کو پلا دیا۔ خیال تھا کہ وہ اس پر چند روز اور نکال لیں گے۔ میں اور جان نے ”نیا“ کے محل وقوع کے بارے میں خاصا غور و خوض کیا۔ میرا خیال تھا کہ جان سمت کا تعین کرنے کا ماہر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم شمال مشرق کا رخ اختیار کریں۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ تین گھنٹے چلتے رہنے کے بعد ہمیں ریت میں ٹوٹے ہوئے برتن کا ٹکڑا ملا۔ چارلس نے مارک سے پوچھا کہ کیا مل گیا ہے؟ میں نے بتایا کہ برتن ملا ہے۔ ہم ہر قدم نہایت محتاط انداز سے اٹھا رہے تھے۔ چیلی ہماری ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ گیوجن والی کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہمیں ”نیا“ کے آثار تک پہنچنے سے قبل چینی حکام

سے منظوری حاصل کرنی چاہیے۔ میں نے کہا کہ گیو کسی کو کیا پتہ کہ ہم کہاں ہیں؟ غالباً سین آخري آدمي تھا جس نے ایک سوسال قبل یہاں پرانے آثار کی کھدائی کی تھی۔ ہمیں کون بتائے گا کہ ہم سیدھے چلتے جائیں گے اور راستے میں پڑنے والے آثار کو نظر انداز کر دیں گے؟ گزشتہ دس برس سے ”نیا“ کے آثار چینی اور جاپانی ماہروں کی جستجو اور دریافت کا مرکز رہے تھے۔ تیسری صدی سے پہلے، بودھ آثار کا گھوارہ ہونے کے سبب سے ”نیا“ کا علاقہ بین الاقوامی شہرت کا حامل چلا آ رہا تھا۔ یہاں تک رسائی جنوب کی طرف سے ہوتی رہی۔ من فنگ سے ادنوں کے ذریعے پانچ دن میں یہاں تک پہنچا جاسکتا تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم مغرب کی طرف سے، پورا صحراء عبور کر کے، یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم جو کچھ دریافت کریں گے، وہ ہماری شہرت کا موجب ہو گا۔ گیو نے میری بات سنی اور بولا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہاں کھدائی نہیں کرنی۔ اگر تم نے کی تو واپس ارجمند پہنچ کر میری بڑی باز پرس ہو گی۔

میں نے روپرٹ سے کہا کہ وہ کارروان لے کر چلتا جائے، دو گھنٹے کے بعد پڑاؤ کر لے۔ مارک اور میں نے ٹیم سے علیحدگی اختیار کر لی اور علاقے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک گھنٹے بعد ہمیں ریت پر برتوں کے ٹکڑے چھلے نظر آئے۔ لکڑی کا کوئی ٹکڑا نہیں ملا جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ یہاں اگر کوئی مکان تھا تو کس طرح کا تھا۔ چارلس نے ریڈ یو پر اطلاع دی کہ میں ایک گھر میں داخل ہو گیا ہوں، گھر نہیں بلکہ فلیش کا ایک بلاک ہے۔ میں نے پوچھا کہ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ اس نے کہا کہ تمین مکان ہیں۔ میں نے حیرت سے مارک کی طرف دیکھا۔ مارک کا کہنا تھا کہ روپرٹ اگر کسی قدیم گھر کے دروازے میں سے بھی گزر کر، اس میں داخل ہو جائے تو وہ نہیں بتا سکے گا کہ اس نے کیا دیکھا۔ میں نے روپرٹ سے پوچھا کہ وہ صحیح صحیح بتائے کہ اس نے کیا دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں کیرولین کے ساتھ کارروان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ہم اونچائی پر پہنچے اور شاہ کی جانب دیکھا تو پیالہ نما وادی نظر آئی۔ اس کے وسط میں لکڑیاں ابھری ہوئی تھیں۔ صحراء میں اس سے پہلے انہوں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ روپرٹ نے سمت بدلي اور وادی تک پہنچنے کا چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ اطلاع نہ ملتی تو وہ یہاں سے گزر گیا ہوتا۔

ہم وہاں پہنچ تو دیکھا کہ لکڑی کے ستون ہی نہیں تھے بلکہ مکمل دیواریں کھڑی تھیں۔ فرش پر ٹوٹے ہوئے برتاؤں کے لکڑے کھڑے ہوئے تھے۔ چینی ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ اس لیے ہماری کوشش تھی کہ یہاں کے آثار سے متعلق جو کچھ بھی جان سکتے ہیں، اس میں عجلت برتن۔ گیو نے تو ہمیں یہاں کیمپ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ ”نیا“ کے پارے میں کچھ زیادہ پر جوش نہیں تھا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ ہمیں یہاں کھدائی نہیں کرنی چاہیے۔ بہ صورت دیگر اسے چینی حکام کے سامنے مشکل پیش آ سکتی ہے۔ ریوپرٹ کا کہنا تھا کہ ایک دن یہاں کے آثار، برٹش میوزیم کی زینت ہوں گے اور ہمیں سے موسم ہوں گے۔

مارک اور میں اونٹوں کے تعاقب میں چل رہے تھے۔ نصف گھنٹے تک تیز تیز چلنے کے بعد ہم نے انہیں جالیا تھا۔ ریوپرٹ نے جس طرح بتایا تھا کہ پہلے مکان کے آثار ایک سطح مرتفع پر تھے، صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ ملیا میٹ نہیں ہوئے تھے۔ چینی کیمپ میں چلے گئے۔ میں اپنے طور پر وہاں کھڑا رہا اور مارک مودی کیمرے سے تصویر بناتا رہا۔ میں برتاؤں اور ہڈیوں کو بچاتا ہوا اور پر چڑھ گیا۔

پیچ کر رہے تھے، جن کے کنوں پر لکڑیوں کے ستون تھے۔ عمارت 40 فٹ لمبی اور 20 فٹ چوڑی تھی اس میں تین بڑے کمرے تھے، چھت ٹوٹ گئی تھی۔ شمال کی جانب صحن میں درخت کا تھا۔ عمارت کی بنیاد میں بھی لکڑی ڈالی گئی تھی، 7 اور 16 انچ چوڑی، ہر دو فٹ پر اس میں جوڑ ڈالا گیا تھا۔ جوڑ پر عمودی لکڑیاں کھڑی کی گئی تھیں۔ سارا کام حیران کن ہر مندی سے کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جوڑ جدید آلات سے بنائے گئے ہیں۔

ایک قدیم عمارت میں کھڑا ہونے اور وہاں سے نوادر چنٹے کی جو خوشی حاصل ہوئی اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں عالم سرور میں ایک عمارت سے دوسری عمارت میں گیا۔ صحرائی میں 29 دن گزارنے، 400 میل کا سفر کرنے کے بعد ہم نے لکلام مکان کے قدیم آثار کی باقیات دریافت کر لی تھیں۔ میں نے دو گھنٹے تک، آثار کا مکمل جائزہ لیا اور تین مزید عمارتیں اور ان کے گرد ایک ایک پانچ کی باقیات دریافت کیں۔ اس میں اب تک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ سارے آثار ”نیا“ کے کنارے زرعی

آبادی کے تھے، جو تیسری صدی عیسوی تک قائم تھی۔ تارم کے طاس پر چینی حاکمیت کے خاتمے سے ہی یہ بستی اجڑی۔ ایک گھر مویشی رکھنے کے کام آتا تھا۔ اس کے ایک جانب برتوں کے نکڑوں، گھنیلوں، کوئے، چارے، جانوروں کی ہڈیوں اور گوبر کی کئی تھیں۔ مارک نے گائے کا گوبراٹھا کر مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ سترہ سوال پرانا گوبر ہے۔

میں وہاں کے آثار پر تفصیلی مشاہدے اور مطالعے کے لیے کئی روز قیام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پانی کی کمیاں اور صحت کے سائل کے پیش نظر یہ ممکن نہ تھا۔ یہاں قدم قدم پر تواری موجود تھے۔ انہیں سمیٹنا اور ساتھ لے جانا ناقابل قیاس تھا۔ ہمیں کھدائی کرنے کا بھی اختیار نہیں تھا۔ ہمارے پاس ایسے تربیت یافتہ افراد بھی نہیں تھے جو مطالعے اور مشاہدے کے تقاضے پورے کر سکتے اور واضح نتائج اخذ کیے جاسکتے۔ ہمیں ششیں کا ایک ساغر ملا۔ وہ وہاں کیسے پہنچا؟ کیوں کہ ایک روز پہلے تو وہ نہیں تھا۔ پتہ چلا کہ الجیور نے وہاں سے کئی چیزیں نکالی تھیں۔ وہ اپنی قیمتی اشیا گھروں میں کہاں چھپاتے ہیں؟ اسی علم کی بنا پر انہوں نے یہاں ان جگہوں کی کھدائی کی کہ جہاں عام نظر نہیں جاسکتی۔ ہمیں دیواروں میں کئی سوراخ دکھائی دیے۔ وہاں سے یہ اشیا نکالی جا سکتی تھیں۔

صحح کو کوچ کرنے سے قبل، جب بعض افراد ناشتہ کرنے میں مصروف تھے اور بعض ادنوں پر سامان لادر ہے تھے، میں نے اس جگہ کا ایک بار پھر معافی کرنا چاہا۔ میں نے کھروں میں کھڑے ہو کر ان لوگوں کے بارے میں سوچا، جو سترہ سو برس پہلے یہاں رہتے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ ملحقہ باغ سے بھیڑوں کو ہاک کر باہر لے جا رہے ہیں۔ عورتیں باور پی خانے میں چولھے جلانے کھانا پکارتی ہیں۔ بنچے ریت میں کھیل رہے ہیں۔ لوگ مویشی چانے باہر جا رہے ہیں۔ ایک ایسی وادی میں جہاں قدیم زمانے کے گھروں کے کھنڈر بکھرے ہوئے ہیں، کبھی نہر بھی بہتی تھی جو کھیتوں کو سیراب کرتی، پھل دار درخت اگاتی اور وادی میں خوش رنگ پھولوں کے قطعات بچھاتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اب نہ وہ نہر تھی، نہ کھیت اور درخت تھے، بس ریت ہی ریت تھی۔



باب 14

چینی

چینی ارکان میں آنے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ خاصاً دلچسپ تھا۔ ایک ماہ بعد گیو جن والی میں قائدانہ صلاحیت بیدار ہو گئی تھی۔ وہ اونٹوں کے اطوار اور خصائص سے اور المغیور کے طریق کار سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ کہیں کوئی غلطی ہوتی دیکھتا تو اس کی فوراً اصلاح کر دیتا۔ گیو اور روپرٹ کارروان کی تنظیم سے متعلق جو فیصلے کرتے، ان پر نظر ثانی کی کم ہی ضرورت پیش آتی۔ انگریز اور چینی ارکان میں کھنچاؤ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے میں تامل و تذبذب کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ گیو سمیت سبھی میری رائے کا احترام کرتے۔ گیواب کھل کر باتیں کرنے لگتا۔ میں نے پوچھا کہ ڈنگ سیاہ بنگ کے مرنے کے بعد کیا ہو گا، اس کا کہنا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں نے کہا کہ کہیں اولڈ گارڈ کے واپس آنے کا امکان تو نہیں۔ اس کا جواب تھا کہ قطعاً نہیں۔ اس لیے کہ اولاً اولڈ گارڈ میں سے چند افراد ہی باقی رہ گئے ہیں۔ قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ چینی عوام اپنی کاریں خود چلانا اور کاروبار سے پیسہ بانا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی کاریتھی دی ہے اور مکان رہن رکھ دیا ہے۔ اس طرح جو پیسہ ملا ہے اسے کاروبار میں لگاؤں گا۔ میں جب صحراء سے واپس جاؤں گا تو سنکیاں گن نیچر ٹریول سروں کے لیے نہیں، جو سر کاری کمپنی ہے۔ اپنا کاروبار کروں گا۔ میں نے گیو سے پوچھا کہ تم ارچی میں کب تک رہو گے۔ تم اپنے والدین کے ساتھ منوریا سے وہاں گئے تھے۔ اس نے کہا کہ کچھ پیسہ ہاتھ آ گیا تو میں موجودہ ملازمت چھوڑ دوں

گا۔ اکثر نوجوان چینی سکیانگ میں نہیں رہنا چاہتے۔ اس لیے کہ یہ بہت دور ہے۔ دوسرے یہاں کے لوگ بھی نہیں چاہتے کہ ہم یہاں رہیں۔ میں ارچی، ہوتن اور شاچی گیا ہوں، یہاں کے لوگ آزاد منش ہیں۔ ان کی زبان، ان کی ثقافت اور ان کا مذہب ہم سے الگ ہے۔ چینی عوام پیسہ کار ہے ہیں۔ نوجوان ان کی تقلید میں آزادانہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔ میرے خاندان کی طرح دوسرے چینی خاندان جو چالیس برس پہلے سکیانگ میں جرا آباد کیے گئے تھے، یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس طرح چینی اور مقامی اقلیتی لوگوں میں توازن برقرار رہے گا۔ ممکن ہے یہ تبدیلی فوری طور پر نہ ہو لیکن ہو گی ضرور۔ ہم نے اس چینی قانون کے بارے میں پوچھا جس کے تحت بیاہتا جوڑے صرف ایک پچہ پیدا کرنے کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ یہ قانون چین کی روایت کے خلاف ہے۔ بڑے خاندان، بڑھاپے میں معمر لوگوں کے لیے تحفظ کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مغربی ملکوں میں ہے، خاندان کے کم عمر اکان اپنے بوڑھوں کا خیال رکھتے ہیں اور ان کی ہر طرح کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اس نے کندھے جھکے اور کہا کہ یہ قانون ہے۔ لیکن کیا تم زیادہ بچے نہیں چاہتے۔ اس کا جواب تھا، چاہتے تو ہیں مگر ہمارے ملک میں اس کی گنجائش ہی نہیں۔

لاڈ زہاؤ کی عمر 56 برس تھی۔ ثقافتی انقلاب سے قبل اس کے چار بچے ہو چکے تھے۔ ایک انجینئر نگ فیکٹری چلا رہا تھا۔ ایک روز میں شیف تھا۔ تیسرا موٹر گاڑیاں فروخت کرتا تھا۔ چوتھا بھی پڑھ رہا تھا، اس کے دو پوتے بھی ہیں۔

”کیا تمہارے پوتے اپنے دادا کو دنیا کا لمباتین صحراء بور کرتے دیکھ کر حیران نہیں ہوتے؟“

”بالکل نہیں، میں 36 برس سے صحراء میں آتا جاتا رہا ہوں۔“

لاڈ زہاؤ بربانوی ارکان میں خاصا مقبول ہو گیا تھا۔ وہ تمام چینیوں سے زیادہ جذکش تھا، وہ کبھی کارروان کے پیچھے چلتا نظر نہیں آیا۔ وہ دل کی بات زبان پر لاتے نہیں ڈرتا تھا۔ جو صحیح سمجھتا، بلا تکلف کہہ دیتا۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ثقافتی انقلاب سے پہلے کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔

صح کو جب ہر کوئی جاگ اٹھا تھا اور دن کا آغاز ہو رہا تھا ریپورٹ نے مجھے

سے کہا کہ وہ سخت جان بوڑھا آدمی ہے۔ اس وقت درجہ حرارت ۱۰ فارن ہائیٹ تھا۔ سخت سردی تھی، ہاتھوں کو پھونک مار مار کر گرم کیا جا رہا تھا اور جسم کو گرم کرنے کے لیے شال لپیٹ رکھی تھی۔ لاوزہاؤ منہ میں سگریٹ دابے، صبح کے ناشتے کی پنجی کچھی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ اس نے حسب معمول ڈھیلی ڈھالی سیاہ پتوں، کالر کے بغیر کی گندی قمیص اور بھورے رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ روپرٹ نے صمرا میں آنے کے بعد سے چینیوں پر کبھی اعتناد نہیں کیا۔ معاملات میں ان کی دخل اندازی پر برا منایا۔ پہلے ہفتے کے دوران میں امدادی ٹیم سے ریڈ یو پر رابطہ کرنے میں اسے مشکل پیش آتی رہی۔ ان دونوں وہ شدید پیمار تھا، اس کے جسم میں پانی ختم ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر پیچش نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اس کی فکری صلاحیت متاثر ہوئی تھی۔ لاوزہاؤ اس کی افتداح سے ناواقف تھا۔ اس نے تجویز کیا کہ روپرٹ نے ریڈ یو کے لیے جوتا رکھا ہے، اس کا رخ غلط جانب ہے۔ اس نے اپنے بازو کو پھیلا کر شاہراہ ریشم پر شاپی کی طرف اشارہ کیا کہ تار اس طرف ہو گا تو پیغام رسانی میں آسانی ہو گی۔

روپرٹ پھٹ پڑا، ”یہ احق بوڑھا چینی، ریڈ یو کے بارے میں کیا جانتا ہے؟“
میں نے کہا ”نہیں، وہ نہیں جانتا، لیکن غالباً اتنا جانتا ہے کہ شاپی کس جانب
ہے۔“

”یہ سارے فضول لوگ ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے انہیں ساتھ کیوں لگا رکھا ہے۔ بتاؤ وہ کیا کر سکتے ہیں؟ کیا وہ راستہ دکھا سکتے ہیں؟“
”دنہیں۔“

”کیا وہ ریڈ یو چلا سکتے ہیں؟“
”دنہیں۔“

”کیا وہ سیٹلائٹ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں؟“
”دنہیں۔“

”بی بی سی کے پیغامات ریکارڈ کر سکتے ہیں؟“
”دنہیں۔“

”کیا ان میں سے کوئی تربیت یافتہ ڈاکٹر ہے؟“

”نهیں۔“

”تو وہ پھر کیا کر سکتے ہیں؟“

خوش قسمتی سے خاصا وقت گزر گیا تھا۔ گیو جن والی اور لاوزہا دونوں نے ہم سب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ان کے کردار پر کسی نے حرف زنی نہیں کی تھی۔ لیکن دوسرے دو کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ صحرائیں اتنے کے تین دن بعد بھی زہانگ اور بوبانے ٹیم کے دوسرے ارکان سے سوچنا ترک نہیں کیا تھا۔

جس تو یہ ہے کہ گزشتہ دو ہفتوں سے چیوالائی کے رویے میں خاصی بہتری ہوئی تھی۔ وہ مل کر کام کرنے کی ضرورت کو سمجھ گیا تھا۔ کم سے کم سب کی بقا کے لیے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ جہاں پانی کے لیے کنوں کھو دنا ہوتا تو وہ پیش پیش ہوتا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد، جو صحرائیں سفر کرنے کے سلسلے میں کرنا پڑتی، کنوں کھو دنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم نے عرصے سے سوچنا ترک کر دیا تھا کہ اس کے بھاری سامان میں ریڈیو کے آلات ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے کنٹرولروں کو اطلاعات پہنچایا کرتا ہے۔ اس نے تصویریں ضرور اتاریں لیکن ان میں سے پیشتر طفلا نہ نوعیت کی تھیں۔ گزشتہ مہینے کی مشکلات کے باوجود اس نے حوصلہ نہیں ہرا تھا۔ وہ دوسروں پر دباؤ ڈالنے کا بھی قائل نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ جسمانی طور پر ہم سب سے بہتر تھا۔

میں نے اسے صحراء بور کرنے والی ٹیم میں شامل رکھا۔ اس کی موجودگی، ہماری ہم کے جاری رہنے کی مہانت تھی، مجھے ڈر تھا کہ حکام کسی وقت بھی ہماری ہم کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ زہانگ بوبہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے آسیجن کے بغیر کے ٹوسرے کی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں شدید سردی اور برف کے باعث جم گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہماری ہم میں کارگر ثابت ہو گا۔ سبھی چینی ارکان، جن کے بارے میں میرا رو یہ تلخ اور درشت تھا، صحراء کو بور کرنے کی ہم میں سرگرم عمل رہے۔ ہماری مجموعی کامیابی میں ان کا حصہ تھا، جس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔



باب 15

ستارہ شناسی ختم

”نیا“ سے توجہ جلد ہی ہٹ گئی، اب چلنا، چلنا، مدام چلنا کی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بغیر اور کچھ سوچتا بھی نہیں تھا۔ تکلا مکان کی مشرق کی جانب لیو بز ہوا گک تک پہنچنے کے لیے چار چھ ہفتے صحراء میں مزید چلنا تھا۔ چاہئے کے باوجود ہم اپنی رفتار تیز نہیں کر سکتے تھے۔ ٹیلے ہماری راہ میں رکاوٹ تھے، اونٹ بھی کمزور ہو گئے تھے۔ ناگوуз بستی سے نکلنے کے بعد اونٹوں نے سات آٹھ دن صرف دو بائی پانی پر ہی گزر کی تھی۔ سارے بانوں کا کہنا تھا کہ پانی نہ ملاتا تو اونٹ چار پانچ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتیں گے۔ لیکن وہ زندہ رہے، سوال تھا کہ سارے بانوں کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہیں؟ اونٹ کو باقاعدگی سے پانی نہ ملے تو وہ پوری خوراک بھی نہیں کھاتا۔ مجھے تشویش تھی کہ اونٹ ایک بار گر جائے اور اس کی زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا۔ مشرق وسطی میں لارنس آف عربیا کی مہم کی پیروی کے دوران میں مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا۔

پانی کی عدم دستیابی نے ہمارا اعتماد ختم کر دیا تھا۔ اگر باری نے پانی کی فراہی کا بندوبست نہ کر لیا ہوتا تو کم سے کم چھ بلکہ زیادہ اونٹوں کی پیاس اور بھوک سے ہلاکت یقینی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ ہم نے یہ علاقہ پہلے عبور نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت یہاں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی اور ہماری کامیابی کا امکان ختم ہو جاتا۔ اصل مصیبت پرانے دریا کی خشک گودی نے ڈھانی۔ نقشے پر ناگوуз بستی سے یادا ناگوуз تک کے راستے

پر نیلہ نشان لگائے گئے تھے جو اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ یہاں پانی موجود ہے۔ کنوں کھودا جائے تو پانی ضرور مل جائے گا، لیکن نہیں ملا، چھوٹ کی کھدائی کے بعد بھی سوکھی ریت ہی نکلتی رہی۔ کسی ایک جگہ سے بھی پانی کے آثار دریافت نہیں ہوئے۔ کیرولین نے بجا طور پر اسے موت کی وادی کہا۔ بہت بعد میں اکٹشاف ہوا کہ مارکیٹ سے مزار تاغ تک ہمیں پانی ملتا رہا۔ لاوزباد سے بات چیت میں اس نتیجے پر پہنچے کہ مزار تاغ پہاڑ کا مشرقی غربی سلسلہ بر قافی پانی کے ڈیم کا کام دیتا ہے۔ پہاڑ سے برف پکھلتی ہے تو پانی شمال کا رخ اختیار کر لیتا ہے اور تارم کے طاس میں داخل ہو جاتا ہے۔ مزار تاغ اور ناگو زیستی کے درمیان دوریا ہوتا اور کریبا بہتے تھے۔ جب تک ان میں ریت نہیں بھر گئی ان میں پانی آتا رہا۔ خنک ہو جانے کے باوجود سال میں ایک آدھ باران میں خاص مقدار میں پانی آ جاتا اور شاہراہ ریشم کے قریب کے نیچی علاقے زیر آب آ جاتے۔ ناگو زیستی کے مشرق میں ہم نے جو راستہ اختیار کیا اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔ آگے کیا ہو گا؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ کسی جگہ بھی پانی کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی۔ سات روز تک ہم پانی سے محروم رہے۔ ہمیں زیادہ تشویش اونٹوں کے بارے میں تھی، وہ کئی روز سے پیاسے تھے، ہم اس خیال میں رہے کہ انہیں کوہاں سے ضروری غذا ملتی رہے گی۔ اسی دوران میں چند اونٹ بیمار ہو گئے اور ہمارے سامنے یہ سوال ابھرا کہ ہم کامیابی سے ہم کنار ہو سکے گی یا ناکام ہو جائے گی۔ جو اونٹ تدرست تھے انہوں نے اتنا سامان اٹھا کر کھا جو ہمارے سفر جاری رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

ہمارے تیس اونٹوں میں سے آٹھ کی جسمانی حالات کمزور تھی، چھ زخمی تھے کیرولین ان کی مرہم پئی کرتی رہی۔ کمزور اونٹ بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ ایک اونٹی "نیا" پہنچنے سے ایک رات پہلے گرگئی۔ چینی آٹھ کے عدو کو خوش قسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔ لیکن اونٹوں سے متعلق یہ عدو خوش قسمتی کا موجب ثابت نہ ہوا۔ ایک روز گیو کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے اسے ایک اونٹ کے بارے میں عرب بوس کی کہانی سنائی، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اونٹ تمہیں حیرت جانتے ہوئے کیوں دیکھتے ہیں؟ اس نے لفی میں جواب دیا تو اس سے کہا کہ عرب بدوس کا کہنا تھا

کہ اللہ تعالیٰ کے سو نام ہیں۔ ہم 99 نام جانتے ہیں، جو ایک نہیں جانتے، وہ اوٹ جانتے ہیں۔ ”کیا واقعی؟“ گیو نے کہا اور پوری کہانی، دوسرے سارے بانوں کو کہہ سنائی، کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ولفرڈ ٹھیسی گرنے عرب میں بدلوں کے ساتھ ہزاروں میل سفر کیا تھا۔ اس دوران میں اس نے کسی کو اوٹ سے بدلوکی کرتے نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس اونٹوں کی ضرورت پہلے پوری کی جاتی۔ ہنکلا مکان صحراء میں معاملہ مختلف تھا۔ سارے بانوں کو مارنے سے پہنچاتے نہیں تھے۔ دو دن بعد 24 اکتوبر کو یوانا گنور کے شہاب میں پہنچے، یہاں ہمارا دو دن قیام رہا۔ ہم جسمانی اور ذہنی طور پر بہت کمزور ہو گئے تھے۔ آگے دو منزلیں تھیں۔ ایک 150 میل پر تاتر ٹنگ اور دوسری اس سے 190 میل پر لیوبز ہوا ٹنگ، ان تک رسائی، ہماری قوت برداشت کے لیے امتحان کا درجہ رکھتی تھی۔ روز بروز چلنے کی مشقت اور خواراک کی کمی نے ہمیں بے حال کر دیا تھا، اور یہ سوال پوچھا جانے لگا تھا کہ کیا باقی ماندہ سفر جاری رکھ سکیں گے؟ ہم نے اب تک جتنا سفر کیا تھا، اس سے دو گنا درپیش تھا، روپرٹ نے کہا ”تمہیں یاد ہو گا کہ فوج میں روز روز کے کام کے چارٹ بنتے ہیں۔ جو ایک طرف اخلاقی حوصلہ مندی کے طالب ہوتے ہیں اور دوسری جانب کچھ کر کے دکھانے کے جذبے کے محک ہوتے ہیں۔“ اس موقع پر کیتھ دوبارہ ہم سے آ ملا۔ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھایا اور ہم یو پوسٹ کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ مزارتاں کے بعد سے اس میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ دنیا داری کے آداب سیکھ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک مہینے تک ماہیوں ٹولے میں رہنے کا کچھ اثر نہ ہونا تھا۔

26 اکتوبر کو ہم نے نئی منزل کی طرف کوچ کیا۔ کیتھ کی رفاقت اور گفتگو کی تازگی نے مارک اور روپرٹ کے گرد ہوئے انداز گفت گو کا اثر زائل کر دیا۔ میں نے دونوں کو کارروائی کے آگے اکٹھے چلنے سے منع کر دیا۔ وہ جان بوجھ کر ماہیوں کن باتیں نہیں کرتے تھے۔ بہر حال میں نے سوچا کہ ان کے بعد دوسرے بھی اسی طرح سوچنے لگیں گے اور تمیں میں کئی دراثتیں پڑ جائیں گی۔

دن ختم ہوا تو میں نے کہا کہ ہمیں ہر وقت ساتھ چلانا چھوڑ دینا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ چینی آخر میں رہتے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ ”ہم“ اور ”ان“ میں تقسیم کی

صورت پیدا ہو۔ ہمیں اکٹھا اور اتفاق سے رہنا ہے۔ ایک دوسرے کو سہارا دینا اور ایک دوسرے کو برداشت کرنا ہے۔ اگلی صبح کو اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں بی بی سی کی نشریات کی ریکارڈنگ کرتا رہا۔ مارک نے نے دھیانی میں کہا کہ صحراء میں کوئی ڈراما نہیں ہو رہا۔ کسی کو آپ کے فرمودات سننے میں دلچسپی نہیں۔ میں نے اسے واسطہ دیتے ہوئے کہا کہ تم مایوسی پھیلانے کا کاروبار کرنا چھوڑو۔ وہ پیچھے ہٹا اور اس نے مجھے عجیب نظریوں سے دیکھا۔ میں اس کی طنزیہ باقاعدہ پر خفگی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے چار ہفتے چینیں اور ہائیگنگ میں اور اس سے قبل چند مہینے اکٹھے گزارے تھے، جن کے دوران میں ہمارے درمیان یہاں پیدا ہوئی تھی۔ مزار تاغ پہنچ کر اسے اپنی ٹیم میں شامل کر کے خوشی ہوئی تھی۔ اس نے بھی اسی احساس کے تحت بعد میں مغدرت کر لی۔ مجھ پر کتنا دباؤ ہے، وہ اس سے بے خبر تھا۔ میں اس سے موانت محسوس کرتا تھا اور اس سے ذاتی نوعیت کی باتیں کر لیتا تھا۔ ہم گھنٹوں ایک ساتھ چلتے رہتے تھے۔ اس نے مجھے اپنے پچپن کے بارے میں بتایا تھا، اپنے معدود رہاپ کا ذکر کیا تھا، جونار خوک میں میری ماں کے قریب ہی رہتا تھا۔ دونوں تنہا تھے اور دونوں کو اپنے بیٹے میں دلچسپی تھی، جو تکلامکان صحراء کو عبور کر رہے تھے۔ میں مارک کی باتیں دلچسپی سے سنتا تھا۔ اس کی ماضی کی مشکلات اور مستقبل کے اندیشوں سے آگاہ تھا۔ کئی اعتبار سے وہ میرا آئینہ تھا۔

موسم اچانک تبدیل ہو گیا۔ راتیں ٹھنڈی ہو گئیں اور کنٹیزروں میں پانی برف بننے لگا۔ اس کے باوجود ہم کھلے آسان تلے سوتے۔ صبح جاگتے تو ہمارے سلپنگ بیک پر سفید کھرجی ہوتی۔ ہم پیڑیوں کو گرم رکھنے کے لیے اپنے بستروں میں رکھ لیتے لیکن اس کے لیے جتنی گنجائش ہوتی، اسی سے کام لے سکتے تھے۔ اب تارے دیکھنا موقوف ہوا۔ رات کو بستروں میں گھنسنے اور گرمی پیدا کرنے میں عجلت برتنی جانے لگی۔ المغیور اونٹوں کے کچاووں پر اکٹھے مل کر سوتے۔ وہ جو چیز بھی ہاتھ آتی اپنے بستروں پر ڈال لیتے۔ سرد صحنوں کو جا گنا اور تیاری کرنا خاصا مشکل ہوتا۔ ہاتھ سردی سے سن ہوتے، انہیں گرم کرنا اونٹوں پر سامان لادنا، اب پہلے کی طرح آسان نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی سُست رو ہو گیا تھا۔ موسم گرم تھا تو ایک قیص اور نیکر میں

بھی چل پھر لیتے تھے۔ اب پتوں میں اور جیکٹ پہنچ پڑ گئے تھے، دوپہر تک دن گرم ہو جاتا، اکتوبر کے آخری دنوں تک پانی کی بوتوں میں برف کے ٹکڑے تیرتے نظر آ جاتے۔ موسم کی یہ تبدیلی ہمارے لیے ایک نئی مشکل کا موجب ثابت ہوئی۔

30 اکتوبر ہفتے کے روز میں نے اپنی ڈائری میں لکھا ”صح کو اپنے گرم سلپنگ بیک سے نکانا اور سردی کا سامنا کرنا ایک امتحان سے کم نہیں۔“ خوبست صح کو کپڑے پہنچنے تک کام رحلہ بھی مشکل سے طے ہوتا ہے۔ مارک سب سے آخر میں اپنے گرم بیک سے نکلتا ہے۔ میرے پاؤں زندگی ہیں اور درد کرتے ہیں۔ سردی کے باعث تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں بوث پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیرولین ابھی تک جراں نہیں پہنچتی۔ ہم نے کیون یون پہاڑ کی پرچھائیں سی دیکھی ہے۔ سورج چڑھاتو پورا منظر ہی بدلتا گیا۔ صح کے رنگ نرم اور پلیے ہیں۔ صح کے ناشتے میں ایک مگ چائے، تھوڑا سا دلیہ اور ڈبل روٹی کا ایک آدھ توس ملا ہے۔ تھرا میٹر پر 12 درجے فارن ہائیٹ ریکارڈ ہوا ہے۔“

دوسرادن ایک اور سب سے یادگار ثابت ہوا۔ میں سفر کی طوالت کے باعث بے ہمتی کا شکار تھا اور ابھی 300 میل کا سفر باتی ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے اور ہم نے قریباً 500 میل کا سفر کر لیا ہے۔ میرا کچھ کر گزرنے کا جذبہ قدرے ماند پڑ گیا ہے۔ ریتلے ٹیلوں کے سلسلے اب میرے خیال میں نہیں اور نہ ایک مہینہ اور صحرائیں گزارنے کے بارے میں سوچتا ہوں، میرا جسم تھک گیا ہے اور جذبات میں بھی پہلی سی شدت اور تو انائی باتی نہیں۔ لیکن اس کا کوئی مادا نہیں۔ نہ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت ہے۔ سہ پہر کو کارروان سے آگے چلتے ہوئے میں 300 فٹ اونچے نیلے پر چڑھا، میرے پاؤں ریت میں ڈنس گئے اور مجھے نیچے گرنے سے بچنے کے لیے اپنی چھڑی کا سہارا لینا پڑا۔ سامنے کا منظر ویسا ہی تھا جیسا روز دیکھنے میں آ رہا تھا۔ میں سخت بدول ہو گیا تھا اور ہمت ہارنے لگا تھا۔ مجھے ساری ہم بے فائدہ دکھائی دینے لگی۔ میں مکمل ہمت ہار بیٹھا۔

اسی لمحے مجھے سُر سنائی دی، جیسے میرے ساتھ بیڈنگ رہا ہو۔ یہ میرے والد کا پسندیدہ گیت تھا۔ میں نے برسوں سے یہ گیت نہیں سناتا، نہ والد کے حوالے سے کبھی

یہ گیت یاد آیا ہے۔ اچانک میرے والد کی تصویریں چاروں طرف نمایاں ہونے لگیں، سر بھتی رہی اور والد کے چہرے پر مسکراہٹ کھلیتی رہی۔ ایک تصویر میں وہ ہانگ کانگ کے گھر میں جھولنے والی کرسی میں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں اور سر سے ہم آہنگ اپنا پاؤں ہلا رہے ہیں۔ ان کا چہرہ میرے چاروں طرف ایک بلبلے کی صورت میں تیر رہا تھا۔ میں چلتا گیا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کچھ دور گیا تو میں نے اپنے آپ کو گیت کے بول، اپنی سیٹی میں ڈھلنے محسوس کیے۔ میری آنکھوں سے آنسو، میرے ریت سے بھرے گالوں اور داڑھی پر بننے لگے۔ میں رونے لگا، اوپھی آواز میں رونے میں مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے والد کو اپنے ساتھ اور اپنے اندر محسوس کیا۔ ان کی موجودگی کے غیر معمولی احساس نے میرے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیا تھا۔ میں مغلوب الجذبات ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آنسو نہیں پوچھے، انہیں بننے دیا اور اپنے ہونٹوں اور زبان پر ان کی نمکینی محسوس کرتا رہا۔ اس سے مجھے نئی توانائی تھی۔ جب اس کیفیت سے نکلا، گیت کے سر کو سیٹی میں سوتا ہوا آگے بڑھا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ مجھے ایسے میں جو آسودگی ملی، وہ میری یادوں میں محفوظ رہے گی۔

اکتوبر کے آخری دن گزرتے گئے۔ میں نے فوج چھوڑنے کے فیصلے پر قائم رہنے کا عزم کر لیا۔ یکم نومبر کو مجھے سرکاری طور پر تنخواہ کی ادا ہیگی بند ہو جانی تھی۔ چودہ برس کی ملازمت ختم کرنے کا یہ طرفہ طریقہ تھا۔ میں نے بارنی سے مذاق میں کہا تھا کہ میں نے ہم کا آغاز ایک میجر کی حیثیت میں کیا اور خاتمه ایک سولین کے طور پر کیا۔ صمرا میں گزرنے والا وقت میری دنوں حیثیتوں کے درمیان ایک گدے کا کام دے گا اور مجھے دشتنور دی کی خواہش پوری کرنے کا مزید موقع میرا آئے گا۔ میں نے ہم کے دوران میں کبھی اپنے آپ کو سول ملازمت میں تصور نہیں کیا تھا۔ میں نے فوجی ملازمت چھوڑنے کے فیصلے کو بھی سمجھی گی سے نہیں لیا تھا۔ فوجی ملازمت چھوڑنے کا کوئی سبب بھی نہیں تھا۔ ہم شروع کرنے سے قبل میں وزارت دفاع میں شاف افسر تھا۔ اس حیثیت میں سینر فوجی افسروں اور رسول حکام کو فوج کی تنظیم نو کے بارے میں مشورے دیتا تھا۔ ترقی ہونے کے قریب تھی اور ایک روز مجھے گرین جیکٹ بیالین کی کمان ملنے والی تھی۔ فوج میں رہنا مجھے پسند تھا۔ لیکن میرے باطن میں کچھ تبدیلی آگئی تھی، میں مختلف انداز

163 میں سوچنے والے میں اٹھنے شروع سے بیچپہ جھٹڑا نا اور پاپہر کی چینگی وہ کچھ کرنے کا خواہش مند تھا جس کا میں اہل تھا۔ یہ فیصلہ مآل اندریشی کے زمرے میں آتا تھا۔ اسے آزادہ روی کا مظہر کہا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ میرے تین بیٹے ہیں، ان کی پورش کرنا اور انہیں پروان چڑھانا کوئی آسان کام نہیں۔ میں جانتا تھا کہ فوجی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ جن سے محرومی اختیار کرنا آسان نہیں۔ فوج میں جن لوگوں کے ساتھ رہا، وہ یاد آئیں گے۔ فوجی زندگی کا تنوع، ہر دو تین برس بعد کام میں تبدیلی، اتنی ذمہ داری، وردی اور وابستگی ان پہلوؤں کو کیسے بھلا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی بنا پر ٹھہرے رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ میں ایسے وقت فوج چھوڑ رہا ہوں یا ریٹائر ہو رہا ہوں۔ زودیا پہ دیر اس مرحلے سے گزنا ہی ہے تو پھر تاخیر کیوں کی جائے۔ ایک چیز جو میرے لیے تسلیم کا موجب تھی، کہ جنوری میں مجھے رابرٹ فلینگ کے مرچٹ بنک کے گروپ چیف

ربا تھا۔ کارروان کی رہنمائی کرتے ہوئے، دائیں اور بائیں دیکھتے جانا اور کسی ٹیلے پر چڑھنے کے لیے مناسب طرف کا اندازہ کرنا، اطمینان کا موجب تھا۔ ریت صاف تھی،

صاف کرتا رہا۔ میں نے بیٹھا اور میٹوں کے چہروں کو دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں ریت پر نہیں بلکہ ساحل سمندر پر لیٹا نیلے آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے سوچا ایک لمحے بعد اوپر اور جیک، دونوں نرم ریت پر سے لڑکتے ہوئے آ کر میرے پاس لیٹ جائیں گے۔ میں نے خیال ہی میں دیکھا کہ سمندری پرندے اڑتے اور چینختے گزر رہے ہیں۔

”اوہدا میں یہاں کیا کر رہا ہوں،“ میں زور سے چینا۔

جواب میں خاموش سناتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ ریت پر سے اٹھا۔ میں نے اپنی پیٹی میں بندھی ہوئی چیزیں دیکھیں۔ سب پر ریت کی تہبہ جبی ہوئی تھی۔ میں نے بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا اور آہستہ آہستہ نشیب سے باہر نکلا اور حقائق کی دنیا میں آ گیا۔

ہترنگ کی طرف جاتے ہوئے ہم نے ”نیا“ کے گرد و پیش کے مختلف منظر دیکھے۔ یہاں وہاں درختوں کے چند تنے پڑے تھے۔ دوسرے قدیم زمانے میں آنے والے سیالاب میں آنے والی مٹی کی تہبہ جبی ہوئی تھی۔ میٹوں کے درمیان گرد کے آثار بھی تھے۔ مارک سب سے آگے چل رہا تھا۔ کبھی بکھار جھک کر وہ کوئی سیاہ نکلا اداخالتا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم ان کا کیا کریں گے۔ یہ زمانہ قبل از تاریخ کی نشانیاں ہیں۔ مارک آگے نکل کر انہیں ملاش کرنے لگا۔ کیرولین بھی آٹی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ ٹھہر نے اور دوپھر کے کھانے کے لیے موزوں ہے۔ مارک نے کیرولین کو پتھر کا ایک نکلا دکھاتے ہوئے کہا کہ چارلس تو اسے فلنت کہتا ہے۔ تمہارے خیال میں کیا ہے؟ میں جلدی سے آگے بڑھا، مارک نے جو فلنت کپڑا ہوا تھا، وہ کسی بڑے فلنت کا نکلا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک گول سامنے کی طرح کام مرمریں نکلا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ مجھے ہتھوڑا لگتا ہے۔ مارک نے پوچھا کہ ہتھوڑے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ میرا جواب تھا کہ جب اوزار ایجاد نہیں ہوئے تھے، انسان ایسے سخت پتھروں کو چاقو، کلہڑے، تیر اور ہر طرح کے اوزاروں کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ انہیں ضرورت کے مطابق شکل دے لی جاتی تھی۔ پتھر کے زمانے کا انسان یہی ہتھیار استعمال کرتا تھا۔

ہم کارروان کے پچھلے حصے تک پہنچ تو دیکھا کہ اونٹوں کو ایک دائرے میں بٹھایا گیا ہے اور ان کے کچاووں سے کھانے کی اشیائی کالی جا رہی ہیں۔ لاڈ زہاؤ آیا اور اس نے مارک کی دریافت کردہ فلنٹ کا معانیت کرنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ مارک نے بتایا کہ لاڈ زہاؤ کا کہنا ہے کہ یہ فلنٹ کیون لیون لیون سلسلہ کوہ سے آتے ہیں۔ یہ کوئی دس ہزار سال پرانے ہیں۔ تارم کا طاس، ایک سربز و شاداب وادی تھا، یہاں زمانہ قبل از تاریخ کا انسان بتتا تھا۔ وہ شکاری تھا اور گوشت کی تلاش میں جنگلوں میں پھرتا رہتا تھا۔

”گرینیاٹ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی کیون لیون لیون پہاڑ سے آیا ہے۔ اس طرح کے نمونے اس نے پہلے بھی دیکھے ہیں۔“

کیرولین نے پوچھا کہ فلنٹ کے ٹکڑے ایک جگہ میں ہی کیوں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کا کہنا تھا کہ شکاری یہاں ٹھہرتے اور پتھر کے نئے اوزار تراشتے، اس لیے فلنٹ اس جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ علاقہ جب ندی نالوں اور جنگلوں سے پٹا ہوا تھا تو خانہ بدوسوں کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ سب سے بڑی ضرورت کھانے کی تھی۔ جو یہاں بآسانی پوری ہو جاتی۔ تہذیبیں آتی اور جاتی رہیں۔ زمین کی صورت بدلتی رہی۔ نکلام مکان ریت سے بھر گیا۔ یہاں لئنے والے انسان مت گئے۔ ہمارا صراحتاً پر کوئی دعویٰ نہیں۔ دس ہزار برس میں ان جگہوں پر جہاں تہذیب و تمدن موجود ہے، نئے صمرا بینیں گے، کچھ لوگ ان کو عبور کرنے تکلیں گے۔ صراحتاً کی موجودگی ان کے لیے چیلنج رہے گی۔



باب 16

سلیمان سے نہمنے کا مرحلہ

3 نومبر کی صبح کو میں نے سارے بانوں کو اونٹوں کے قریب دائرة باندھے دیکھا، وہ سب غم زدہ تھے۔ تاتر گنگ کی طرف سفر کرتے آٹھ روز ہو گئے تھے۔ ہمیں ابھی ستر میل سفر کرنا تھا۔ میں نے جو منصوبہ بنارکھا تھا، کیا اس کے مطابق امدادی ٹیک آ ملے گی؟ اس ضمن میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کریم نے گیو سے سلسلہ کلام منقطع کیا۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا اور پوچھا کیا معاملہ ہے؟

”وہ کہتا ہے کہ گئی رات 31 اونٹ تھے۔“

میں کچھ نہ سمجھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

”میں کچھ نہیں سمجھا گیو!“

”گزشتہ رات 31 اونٹ تھے، صبح صرف 30 تھے۔“

”رات آٹھ نمبر اونٹی نے بچہ جتنا۔“

”ہاں تو پھر؟“ میں نے کہا

”لیکن صبح کو اونٹ کا بچہ مردہ تھا۔ سارے بانے اسے دفن کرنے جا رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ ہم کے لیے کوئی اچھا شکون نہیں، وہ تو ہم پرست ہیں۔“

میں سارے بانوں کے پاس گیا۔ وہ مردہ بچے کے گرد بیٹھے تھے۔ اس کی پیٹھ پر بالوں میں خون لگا ہوا تھا۔ اونٹی نے اسے چاٹ کر صاف نہیں کیا تھا۔ قدرت کی یہی مشاہدہ تھی۔ اب سوائے افسوس کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ اونٹی

حاملہ ہے تو ناگزیر پستی سے روانگی کے وقت اسے ہم لیتے ہی نہیں۔ سارباں حلقة
باندھے کھڑے تھے۔ سبھی افراد تھے لیکن سلیمان پر کچھ زیادہ ہی اثر تھا۔
مارک نے کہا کہ سلیمان اس لیے افراد ہے کہ مہم ختم ہونے کے بعد یہ اس کا
نفع ہوتا۔

ریپورٹ بولا ”اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اونٹی کا کیا حال تھا۔ وہ بھاری
بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ آہستہ چلتی، جھولتی ہوئی چلتی۔ کیرولين کوڈاکٹر ہونے کے ناتے
اس کا علاج کرنا چاہیے۔“

اونٹی اچھی بھلی دکھائی دے رہی تھی، اس کا خاصا خون بہہ گیا تھا۔ لیکن اب
لہور گک پانی، بوند بوند کر کے ٹپک رہا تھا، اس نے پچھلی نالگیں کھوئی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا
کہ وہ آرام کر رہی ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ چند روز تک اس
پر کوئی بوجھ نہ لادا جائے۔ وہ چل سکتی تھی، قدرے لڑ کھڑا کر، لیکن دوسرے اونٹوں کا
ساتھ دے سکتی تھی۔ اگر وہ چلنے کے قابل نہ ہوتی تو اسے پیچے چھوڑا جاسکتا تھا۔
کارروان کی رفتار بہت مددم تھی۔ ہر روز جتنے میں بھی چل سکتے تھے، چلتے
تھے۔ کوشش یہی ہوتی تھی کہ کم سے کم تاخیر ہو۔ میلے رکاوٹ نہ بننے اور اونٹوں کی رفتار
تیز رہتی تو ہم اس کے مقامات تک رسائی میں مقررہ اوقات سے پیچے نہ رہتے۔
ترکستانی سرما کے شروع ہونے اور سردی کے اچانک بڑھ جانے کے پیش نظر اور بھی
ضروری تھا کہ سفر میں ہم کسی قسم کی تاخیر نہ ہونے دیتے۔

ہمارا ہر قدم ہمیں لویز ہوا گکے قریب تر کرتا اور ہمارے اس علم کی توثیق کا
موجب ہوتا کہ ہم نے تکلام مکان صحرائ کو عبور کر لیا ہے۔ مزار تاغ سے پہلے کے ریتی
پہاڑوں کو سر کر لینے کے بعد میں نے بھی سمجھی گی سے سوچا تھا کہ ہم جس مہم پر نکلے
ہیں، وہ کامیابی سے ہم کنار ہونے کے قریب ہے۔ ہم نے ہر طرح کی مشکلات کا
 مقابلہ کیا اور ہر امتحان سے سُرخ رو نکلے۔ ہمیں کوئی شک نہیں تھا کہ ہم میں سے کوئی
کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکے گا۔ اونٹوں کا عمومی رو سمجھ تھا۔ وہ بوجھ
امحاطہ قطار میں چلتے، کہیں کوئی مشکل کھڑی نہ کرتے۔ کوئی رکاوٹ بھی پیدا ہوتی تو
فوراً دور کر لی جاتی، کوئی اونٹ ہم سے کسی کو گردیتا اور زخمی کر دیتا۔ اسے معمولی سمجھ لیا

جاتا اور کارروان کے چلتے رہنے میں کوئی رخصنہ پڑتا۔ سلیمان نے گانے کی عادت اپنا لی تھی۔ وہ بے شر اتحا، اس لیے اس کا گانا کانوں کو بھلانہیں لگتا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی گیت، ایک ہی بے شرے انداز میں گانے پر مُصر رہتا جو ہمارے لیے ناقابل برداشت تھا۔

ایک سہ پہر کو جب سلیمان اپنی بے ڈھنگی آواز میں گارہا تھا، روپورٹ نے اسے گرم گرم شکر قندی کھلا دی۔ سلیمان کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ شکر قندی اس کے تالو اور جبڑوں سے چپک گئی، وہ گانا بھول گیا اور ہم اس کی بھدمی اور کرخت آواز سننے کے عذاب سے دل منٹ تک بچ رہے۔

سلیمان کی عمر 51 برس تھی۔ لیکن وہ 70 برس کا لگتا تھا۔ اس نے سارے بانوں کی سربراہی حاصل کر لی تھی۔ جیسے جیسے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا گیا، اس نے اونٹوں پر بوجھ لاد رہے ہوتے وہ اپنے اونٹ کو سہلاتا، اس پر کچاوہ درست کرتا، اس کے کہانوں کے درمیان مکبل اور اپنا پرانا کوٹ رکھتا، پھر اس پر بیٹھ کر اوپنجی آواز میں گالیاں بکتا، اسے ریت کے ٹیلوں پر سے گزارتا چل دیتا۔

چند روز بعد میں نے گیو سے کہا

”سلیمان، سب سے آگے چلنے والے اونٹ پر سواری نہیں کر سکتا۔ اس کے باعث پورا کارروان ست ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس کی سمت بھی صحیح نہیں رہتی، آئندہ اگلے اونٹ کے ساتھ وہی آدمی رہے گا، جو بیوادہ چل رہا ہو، سلیمان اگر اونٹ پر بیٹھنا چاہتا ہے تو ضرور بیٹھے لیکن وہ کارروان کے آگے نہیں آ سکتا۔“

گیو نے زہانگ سے بات کی، اس نے آگے سلیمان اور کریم سے کہا، اس نے کیا کیا، البتہ نتیجہ ڈرامائی تھا۔ سلیمان نے کارروان کے آگے چلنا شروع کر دیا۔ لیکن اس طرح کہ اگلے اونٹ کی گردن سے سر جوڑے چلتا۔ اونٹ گردن بی کرتا تو سلیمان اس کا ساتھ نہ دے سکتا۔ دن ختم ہوا تو سلیمان نے پس پائی اختیار کر لی۔

اونٹ ڈھلوان پر جس مہارت سے اترتے، وہ حیرت ناک تھی، ہم چڑھائی چڑھتے اور اترتے بڑی احتیاط بر تھے، پھونک پھونک کر قدم دھرتے، اونٹ فطری طور

پر آزادانہ چلتے، بہت کم ہوتا کہ وہ لڑکھراتے، معمولی جبکے بعد وہ جو قدم بھی اٹھاتے، اعتاد کے ساتھ اٹھاتے۔ ٹیلے سے گزرتے ہوئے ریت کا ایک ریلا ان کی ناگلوں کو جکڑ لیتا لیکن وہ پروادے کیے بغیر قدم بڑھاتے چلے جاتے۔ دن گزر رہے تھے۔ ایک سی کیسانیت اور ایک سی بے رنگی کے ساتھ۔ ہماری رفاقت بے حد مذہم ہو گئی تھی۔ جہاں زمین سخت ہوتی اس پر قدم تیزی سے اٹھنے لگتے۔ لیکن ریت پر آ کر رک رک جاتے۔ پیچھے بھی ٹیلے، آگے بھی ٹیلے۔ اسی عالم میں ہم نے مارک کی 27 دین سالگرہ منانی۔

کیرولین نے سب سے پہلے جا گئنا، دوسروں کو جگانا اور ناشتہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ وہ مارک کو اس کے بستر میں ہی چائے کا مگ لادیتی۔ وہ لیٹے لیٹے چائے پیتا، سگریٹ کے کش لگاتا اور اپنی ملکی داڑھی کھجاتا، ہم سب نے داڑھیاں بڑھائی تھیں۔ میری داڑھی کیتھ اور مارک کی داڑھی سے لمبی تھی۔ ہم سب نے مارک کو اس کی سالگرہ پر ایک ایک تخفہ دیا۔ کسی نے کھانے کے لیے بمکث دیے، کسی نے پینے کے لیے سگریٹ دیے۔ خوب رونق رہی۔

مارک کی سالگرہ ہم سب کے لیے خوش قسمتی کا موجب ثابت ہوئی۔ اس دن ہم نے سب سے طویل مسافت طے کی، یعنی 13 میل۔ شام کو ہمیں نمک دکھائی دیا، جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں زیر زمین پانی موجود ہے، تین دن پہلے تک نمک کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اونٹ پانی نہ ملنے کے باعث بے کلی کا شکار تھے۔ درجہ حرارت 20 فارن ہائیٹ تھا۔ سردی کا مداوا، جسمانی مشقت میں تھا، پانی کے لیے کنوں کھودا جانے لگا۔ میرا جسم تھکن کے باعث درد سے بھر گیا تھا۔ اور پیٹ میں بھوک کے مارے درد ہونے لگا تھا۔ میرا اوزن بہت زیادہ کم ہو گیا تھا۔

مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کیا گیا۔ کنوئیں سے پانی نکل آیا تھا۔ لیکن کوئی اپنے بوٹوں سمیت اس میں اترنے کے لیے تیار نہیں تھا، بوٹ بھیگ جاتے تو صبح انہیں پہننا نہیں جاسکتا تھا۔ اونٹ، کنوئیں کے گرد جمع کر دیے گئے تھے۔ تین دن بعد انہیں پینے کے لیے پانی مل رہا تھا۔ کنوئیں کی ایک دیوار اونٹ کے بوجھ تلنے گئی، ساتھ ہی اونٹ بھی، اگر عبدالرشید تیزی سے آ کر صورت حال کونہ سنجاالتا تو کریم اور ریوپرٹ

دونوں کچلے گئے تھے۔ جتنی ریت ہٹائی جا سکتی تھی، ہٹائی گئی۔ سارباں کھانے کے بعد آئے اور انہوں نے رسم سے بندھی ہوئی بالٹی کے ساتھ پانی نکالنا شروع کیا۔ یہ عمل سست ضرور تھا لیکن تمام اونٹوں کو پانی پلا لیا گیا۔ اگلے کنوئیں کے لیے مناسب جگہ ملے گی یا نہیں، اس کا انحصار زیادہ تر قسمت پر تھا۔

چینی سونے کے لیے چلے گئے۔ ہم آگ کے گرد بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے۔ باہمی ناراضی اور کشیدگی، جو عموماً پیدا ہو جایا کرتی ہے، ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کریم ہمارے پاس آیا، اس کے بعد دوسرا سارباں بھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ اس نے مارک کو لکڑی کا ایک لکڑا دیا۔ جس پر گوشت کا قیمه رکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ ساربانوں کی طرف سے یہ اس کی سال گرہ کا تھفہ ہے۔ یہ کیسے گوشت کا قیمه تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ مارک نے کھانا شروع کر دیا۔ روپرٹ نے مارک کو ستانے کے لیے کہا کہ اسے مردہ اونٹ کا گوشت نہ سمجھنا۔ مارک اگر روپرٹ کی شرارت کو نہ سمجھتا تو وہ منہ میں رکھا ہوا قیمه تھوک دیتا۔ سارباں اس کے برادرانہ رویے کو دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ گوشت باری نے بھجوایا تھا۔

مارک نے کہا کہ کریم کا کہنا ہے کہ اگر یہ، چینی اور ایغور نے مل کر بہت اچھی شیم ہٹائی ہے۔ شروع میں تو وہ ہمیں ایک بیلی بھی دینے کو روا دا رہنیں تھے اور سوچتے تھے کہ ہم بہت پہلے ناکام ہو جائے گی۔ میں نے ساربانوں کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ مسکراتے، میں انہیں دریتک دیکھتا رہا، لوئیں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ عبد الرشید نے فوجی اور کوٹ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا، اس کی ٹوپی اور عینک نظر آ رہی تھی، اس کا جسم کوٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔

مارک نے کیرولین کے ذریعے کریم سے ایک سوال یہ کیا کہ ساربانوں نے اس سے پہلے مغربیوں کے ساتھ کام نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے کاشغر میں پاکستانیوں کو دیکھا تھا۔ امیر، کیونٹ پارٹی کا رکن تھا لیکن مارکیٹ میں اپنے گھر اسے بہت سی بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس لیے اس کے پاس پارٹی کے کام کرنے کا وقت نہیں بچتا تھا۔ امیر خاموش بیٹھا تھا، وہ ایک چھوٹی سی کالپی پر لکھا کرتا، ہم اسے شاعر کہتے۔ وہ مفکر دکھائی دیتا، ساربانوں میں وہ اکیلا تھا جسے میں نے کبھی کسی اونٹ کو

مارتے نہیں دیکھا، ہمارے ساز و سامان کے بارے میں بتیں ہونے لگیں۔ ہم مہم کے آخری مراحل میں تھے۔ سارباں اس سوچ میں تھے کہ ان کے حصے میں کیا آئے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جب پہلی مرتبہ ہوائی جہاز پر اپنی سے کاشغر کا سفر کریں گے تو جشن منائیں گے۔ باہمی بات چیت بڑی خوش کن تھی۔ ایسے لمحات کم ہی آتے ہیں جب تمام لوگ ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ رات پڑتے ہی ہر کوئی اپنے اپنے حال میں کھو جاتا ہے۔

بعد ازاں میں اور مارک، اپنے اپنے سلپنگ بیک میں لیٹئے اور مارک کی سال گرد کے سگریٹ پیتے بتیں کرتے رہے۔ اگر سارباں سوچیں کہ صحراء میں نکست دے دے گا تو ان کا کیا بنے گا؟ میں یہ مانے کے لیے تیار نہیں کہ انہوں نے جب مارکیٹ میں اپنے بال بچوں کو الوداع کہا تو وہ سوچتے ہوں کہ وہ مرنے کے لیے جا رہے ہیں۔

میں نے مارک سے پوچھا کہ اگر تمہیں بھی یہ خیال آتا کہ صحراء کو عبور کرنے میں موت آسکتی ہے تو کیا تم اس سفر کے لیے تیار ہو جاتے؟
”میں نہیں جانتا، میں نے بھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ موت کا صحرائکھا ہوا تو پڑھا تھا لیکن اس نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔“

”اگر تمہارا گاؤں، صحرائے کنارے ہوتا اور تمہارے باپ دادا نے صحراء پر اتنا قریب ہوتے ہوئے سیوں ہیڈن کو موت کے سفر پر نکلتے دیکھا ہوتا، کیا ساربانوں کو ہمارے ساتھ صحرائیں جانے کی اجازت دی ہوتی؟“

مارک نے کہا کہ انہیں خود فیصلہ کرنے دیا جاتا تو صورت مختلف ہوتی۔ میں نے کریم کو کسی اور سے بتیں کرتے سنائے کہ مارکیٹ سے کمیونٹی میر نے انہیں جانے کا حکم دیا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوا ہو، ان سب کی آپس میں رشتہ داریاں ہیں۔ وہ کسی کے کہنے میں آنے والے نہیں، میرے خیال میں عیسیٰ پولتا نے آنا منظور کیا تو دوسروں نے بھی اس کی پیروی کی۔

ہم خاموش لیٹئے رہے، ہمارے سگریٹ اندھیرے میں جلتے رہے، آسمان پر چاندنیں تھیں، آگ کے گرد بیٹھے جو بتیں ہوئیں، میں انہیں اور ساربانوں کے چہروں کو

رکھتا رہا۔ یہ یادیں میرے ساتھ جائیں گی اور زندگی سے متعلق ان کا سادہ رو یہ اور ان کی خوش مزاجی طویل عرصے تک میری یادداشت کا حصہ رہے گی۔ میں نے کروٹ بدلتی اور سونے لگا۔

مارک نے تھوڑی دیر بعد کہا، تم اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں چھوٹا محسوس نہیں کرتے؟ انہوں نے ہم چند غیر ملکیوں پر اعتماد کیا، ہم سے تعاون کیا اور ہماری بقا کے بارے میں یقین کا اظہار کیا؟

”ہاں، اب میں سوچتا ہوں تو اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتا ہوں۔“



باب 17

ایک فاش غلطی

ہم 6 نومبر کو تاتر گنگ کے قریب رسد کی وصولی کے لیے پہنچے۔ یہ ہمارا صحراء میں اترے ہوئے 45 والے دن تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ لوہہ ہوانگ تک کا 190 میل کا سفر کرنے میں تیرہ دن لگیں گے۔ لیکن رسد کی وصولی کے لیے سولہ دن کی گنجائش رکھی۔ کیونکہ نے تاتر گنگ میں اوتھوں کی پارٹی چھوڑ دی اور ریوپرٹ، کیرولین، مارک اور میں بنیادی ٹیم میں چلے آئے۔

نقشہ پھیلا کر آخری مرحلے کا جائزہ لیا۔ ٹیم کا کوئی رکن بھی ایسا نہیں تھا جو تھکن سے چور نہ ہو گیا ہو، یا جس کو کوئی نہ کوئی جسمانی بیماری یا عارضہ نہ ہو۔ ہمارے دبلے پتلے بدن اور جھریلوں سے بھرے ہوئے چہرے گواہی دے رہے تھے کہ ہم نے کتنی صعبوبتیں سکی ہیں اور کن مشکلات سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ میں نے نقشے پر پنسل سے بنی ہوئی لکیریں اور پڑاؤ کرنے کے مقامات کے نشان دیکھے۔ اس راستے کا تعین کیا جس پر چل کر ہم آخری مرحلے تک پہنچے۔ بہت کم لوگ وہ جائیں گے جن سے ہم اپنے تجربات کے بارے میں تبادلہ خیال کر سکیں گے۔ اس طویل، صبر آزماء اور مشکل سفر کے راز ہمارے سینوں میں دفن ہو جائیں گے، شاید ہی کوئی انہیں کھولنے اور پڑھنے کے قابل ہو سکے۔ کیا زندگی میں ایسا عظیم تجربہ پھر سے ہو سکتا ہے؟ لوگ دور دراز کے سفر سے واپس آتے ہیں تو پوچھنے والے کہتے ہیں ”اچھا تو آپ واپس آگئے؟“ وہ ادھر ادھر کے سوال کرتے ہیں اور ویسے ہی جواب پاتے ہیں۔ باقی روزمرہ

کے مسائل کے بارے میں ہونے لگتی ہیں، میرا نہیں خیال کر سا رہا انوں سے واپسی پر لاتعلقی کا اظہار ہو یا ان سے بار بار گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں نہ پوچھا جاتا ہو۔ ان کی کہانیوں کی ایک ایک تفصیل، پوچھنے والوں کے ذہن میں محفوظ ہو جائے گی اور وہ لوک داستانوں اور لوک گیتوں کا موضوع بن جائے گی۔

امدادی ٹیم اپنی ذمہ داری پوری کر چکی، اس کا کردار پر ظاہرا تنائپر شکوہ نہ ہو لیکن انہوں نے مہم کی کامیابی میں جو حصہ بٹایا، احساس ذمہ داری اور خوش دلی سے بٹایا۔ ان کے بغیر صحراء کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کوئی کارنمایاں انجام نہ دیا ہو۔ ان کی ایک بڑی کامیابی یا وادو ٹنگ گوز کے مشرق میں دریائے اندری کے کنارے اندری کے قدیم آثار تک رسائی تھی۔ دریا خشک تھا، اس کی گودی میں گاڑیوں کو لے جانا قدرے آسان تھا۔ ایک مقامی گائیڈ کے ذریعے وہ متذکرہ آثار تک پہنچ گئے تھے۔

شین نے 1901 کے موسم سرما میں اندری میں کھدائی کی تھی۔ دوسرا مرتبہ نومبر 1906 میں یہاں آیا، اس نے ایک سٹوپا کے قریب ایک قلعہ دریافت کیا۔ اسے دو تین صدی پہلے آٹھویں صدی کے آثار قرار دیا گیا۔ 1901 میں اسے قلعے میں شترنج کے کچھ حصے ملے، جواب برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے اس تاسف کا اظہار کیا کہ اسے پوری بساط نہیں لی۔ باری کی ٹیم کے ایک رکن کوریت میں پڑی مختلف اشیا کے ساتھ شترنج کی بساط کے دو حصے مل گئے، جوہم کے آخر میں چینی امدادی ٹیم کے پرد کر دیے گئے۔ یہ حصے اب کہاں ہیں؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شین نے اپنی ملنے والی اشیا کا کہیں تفصیل سے ذکر نہیں کیا۔ نوے برس بعد باری کی ٹیم نے کچھ چیزیں دریافت کر لیں۔

تاتر ٹنگ میں رسد کے مرکز تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنا اصل راستہ چھوڑنا اور جنوب مشرق کی طرف جانا پڑا۔ دوبارہ اصل راستے کی طرف آنے کے لیے ہمیں شمال کے رخ میں دو روز چلتا پڑتا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے بارے میں کن ارکان نے مخالفت کی۔

گیو نے کہا کہ ”یہ پاگل پن ہے، یہ ممکن ہی نہیں، یہ صحراء کا بدترین حصہ

ہے۔“

لاوزہاؤ کا کہنا تھا کہ ”اس راستے میں ٹیلے بہت اونچے ہیں۔ پانی کے لیے کنوں کھو دنے کا کہیں کوئی امکان نہیں۔“

”دو برس پہلے ایک جاپانی ٹیم نے جس کے پاس تمام ضروری ساز و سامان تھا اور اسے کئی ملین پونڈ کا سرمایہ بھی حاصل تھا، ریو کیا نگ کی جانب سے یو وائی ٹانگوز جانے کے لیے صحراء بور کرنا چاہا لیکن ایک ہفتے بعد ہی انہیں یہ ہم ادھوری چھوڑنا پڑی۔“
”کیوں؟“

”اس لیے کہ ریت کے ٹیلے بہت بڑے اور بہت نرم تھے، اونٹ ان میں چل نہیں سکے۔ اس لیے وہ جنوب کی جانب سے شاہراہ ریشم پر چلے گئے۔ بعد میں اس نے ایک فلم بنائی اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے صحراء کو کامیابی سے عبور کر لیا ہے۔“

بارنی نے علیحدگی میں کہا کہ ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اونٹ موجود ہیں، ہم نے فاضل چربی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اب ہمارے جسم میں ہڈیاں ہیں اور ان پر مڑھا ہوا چڑھ رہے ہے۔ پھر تم لیو بز ہوا نگ کارخ کرنے میں کیوں بچکھاتے ہو؟ صحراء تو تمہیں بہر حال عبور کرنا ہے۔ ہم جہاں ہیں، وہاں سے شاہراہ ریشم آتی میں دور ہے، اس لیے نفعے کے مطابق ہماری چال جاری رہی تو اسے صحیح سمجھا جائے گا۔ میں نے ایک بار تو فیصلہ بدل دیتا چاہا لیکن دوسری بار اس پر قائم رہنے کا عزم کر لیا۔ ریوپرٹ نے میری مکمل حمایت کی۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ فیصلہ کر لیا ہے تو اس پر ثابت قدم رہو۔

گزشتہ ایک ہفتے سے میں ریوپرٹ کی آواز اور مشوروں کو اہمیت دینے اور اس پر انصاف کرنے لگا تھا۔ وہ اونٹوں والی پارٹی میں میرا غیر سرکاری معادوں بن گیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو وہ انتظام سنپھال لے گا اور آخر تک جائے گا۔ میرے اس پر بھروسے اور اس کی الیت نے مل کر ایک خیال کو جنم دیا اور تارنگ سے نکلنے کے دو دن بعد ایک ساتھ چلتے ہوئے ہم نے اس پر تبادلہ خیال کیا۔

”میں نے پوچھا“ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم واپس آؤ گے اور اسکیلے صحراء کو عبور کرو گے؟“

اس کا فوری جواب تھا ”تم یقیناً پاگل ہو۔“

”نبیس روپرٹ! سخیگی سے سوچو کہ اکیلے صحراء کو عبور کرنا کیسا رہے گا؟ تم اپنے تجربات کی بنا پر کامیاب ہو سکتے ہو تمہیں پہنچ چل گیا ہے کہ ادنوں سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے، اور پانی کہاں دست یا ب ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں عناصر، کسی کی بھی کامیابی کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ انگستان میں تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں اور سکیانگ میں ہم نے واقعیتیں کی ہیں۔ ان کے پیش نظر تمہیں ضروری اجازت نامے حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

”کیا تم صحیح ہو کہ یہ ممکن ہو گا؟“

”صحیح منصوبہ اور صحیح ساز و سامان کے ساتھ، یقیناً ممکن ہو سکتا ہے۔“

ہم تھوڑی دور تک خاموش چلتے رہے، ہم نے ہمارا زمین پر بہترین راستہ اختیار کیا تھا۔ دور فالے پر ریت کے ٹیلے حرکت میں تھے اور بلند پہاڑیاں بنا رہے تھے۔ ہمارے پاؤں کے نیچے کی ریت جبی ہوئی تھی اور ہم اس پر پہنچنے تک قدم اٹھا کر چل رہے تھے۔ تھکاوٹ کے باوجود ہم جسمانی لحاظ سے مضبوط تھے۔ موسم مناسب گرم تھا اور چلنے کے لیے موزوں۔ آسان نیلا اور ہوا تیز تھی۔ ریت کا رنگ زرد تھا جس کے سبب سے دور کے ٹیلے خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں یہ خواہش جاگی کہ ہمارا سفر جلد ختم ہو، ہم نے ایک دلیرانہ اور بظاہر ناممکن اعمال کام اپنا لیا تھا، جو آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل طے کرتا جا رہا تھا۔ پہلے چند سو میل کے دوران میں جو خدمات اور پریشانیاں پیدا ہوئیں عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھیں۔ سفر کے دوران میں رسد کی بہم رسانی جاری رہی۔ ہم نے ثابت کر دیا تھا کہ صحراء میں طرح طرح کی مشکلات میں گھر کر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے۔ صحراء، جس کا نام ہی ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو نامساعد حالات سے عہدہ برآ ہونے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا اور اس ناقابل تنفس قرار دیے جانے والے خوف ناک صحراء کو ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا تھا۔

اعتماد نے جو میرے شور میں خطرے کی نشان دہی کرنے کا موجب تھا، مجھ میں آرام ٹلی کا میلان پیدا کر دیا۔ میں کسی خطرناک صورت حال سے نہنے کے لیے شم

دلی سے ہی تیار ہو سکتا تھا۔ صحرائے ہم پر جو آفت بھی ڈھائی، ہم نے اس کا جرات سے مقابلہ کیا۔ ریت کے پہاڑ، بلا کی گرمی، پیچش، بخار، کئی کئی دن اونٹوں کی پیاس کے اثرات، افق تک پھیلیے ہوئے صحراء، اونٹوں کی بیماریاں، ان کا انداھا پین، ہمیں کیا کیا مصیبت نہیں دیکھنا پڑی۔ لیکن ہم نے ہر مصیبت خوشی سے جھیلی اور ہر مشکل کا دلیری سے مقابلہ کیا۔ یہ کہنا تو شاید حماقت ہو کہ صحرائے اپنے دامن میں چھپے سارے حرے آزمائیے۔

بارنی نے کہا کہ تمہاری اب تک کی رفتار کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یوبز ہوانگ کے آخری پڑاؤ تک پہنچنے میں تمہیں نو دن لگ سکتے ہیں۔ تاتر نگ میں بارنی کو الوداع کرنے کے موقع پر اس نے مجھے نصیحت کی کہ اب پہاڑی سے اترنے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہاری کارکردگی اب تک نہایت عمدہ اور اچھی رہی ہے۔

ہم نے امدادی ٹیم کو چیچپے چھوڑا تو ہر ایک میں واپس گھر پہنچنے کی خواہش پوری شدت سے بیدار ہو گئی۔ چینی ترکستان کا انوکھا پین اور صحراء عبور کرنے میں رومانیت کا جو عنصر تھا، ختم ہو گیا۔ سب رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ اب ہر ایک کو آخر میں جشن منانے کی پڑی ہوئی تھی۔ وزن اور غذا میں کمی کے باوجود ہم اچھی حالت میں تھے۔ ہماری ناگنوں کے پٹھے، ٹیلوں پر چڑھتے اترتے رہنے کی وجہ سے لوہے کے سپرگوں کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ البتہ ہم میں قوانینی کی سطح نہایت گری ہوئی تھی۔ ابھی ہمارے سامنے صحراء موجود تھا، جس کے ٹیلوں کو عبور کرنے کے لیے ہمت اور قوانینی درکار تھی۔

کیرولین نے کہا کہ میں سانپ کی طرح ہموار زمین پر رینگ رہی ہوں۔ ڈنی تھکاوث پر قابو پانا اور زیادہ مشکل تھا۔ ہم اپنی بقا کی یکسانیت، کم خوار اکی، ہر روز میلیوں کے سفر، اونٹوں پر سامان لادنے اور اتارنے، انہیں کھلانے اور پانی کے لیے کنوں کھودنے کے باعث تھک گئے تھے۔ اس یکسانیت سے نجات کا کم ہی موقع ملتا تھا۔ کسی بات پر بُنی آ جانا بھی غنیمت سمجھی جاتی۔ ہر بات معمول بن گئی تھی۔ حتیٰ کہ گفت گو بھی دو چار مطلب کے فتوروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

میری اپنی ڈنی تھکن، آئندہ کا منصوبہ بنانے کی ضرورت کے سبب سے بڑھ

گئی تھی۔ چینیوں کے ساتھ مذاکرات میں رخنے پڑنے لگے تھے۔ صحراء بور کر چکنے کے بعد یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ چین سے اپنا سامان کیسے نکالا جائے۔ مالی معاملات میری پریشانیوں میں سرفہرست تھے۔ میں جب تک صحرا میں رہا، مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میں ہر ایک کی رسائی سے باہر تھا، ایسے میں اگر ہزاروں پونڈ بھی صرف ہو جاتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن میرا حقیقت سے یہ فرار وقتی تھا، مجھے علم تھا کہ میری باز پس ہو سکتی ہے، بلکہ ہو گی۔ انتظام اور منصوبہ بندی کا سارا کام باری کے پر د تھا۔ لیکن صحرا سے نکلتے ہی یہ میری ذمہ داری بن جائے گی۔ میری علیحدگی ختم ہوتے ہی مجھے مسائل کا انبار سمیٹنا ہو گا۔ یہ سوچ کر میں چاہنے لگا کہ سفر جلد ختم نہ ہو۔

ریوپرٹ نے کہا کہ ”میرا بس چلے تو سامان لادنے کا ایک مختلف طریقہ اختیار کروں۔“ اکٹھا چلنے کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ بات چیت میں طویل وقفہ آ جایا کرتا ہے اور اتنی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر سے گفت گو اسی فقرے سے شروع کی جاتی ہے جس پر پہلے ختم کی گئی ہوئی ہے۔

ریوپرٹ نے کہا کہ پانی کے کنٹیز ایک آدمی کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کتنے اونٹوں کی ضرورت ہو گی؟

”اس کا انحصار رسد کے مقامات کی تعداد اور محل وقوع پر ہے۔ لو بز ہوانگ سے ٹوگوز بستی تک کا راستہ 400 میل لمبا ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ مغرب سے مشرق یا باعیں سے سیدھے ہاتھ صحراء کو عبور کرنا بہت بڑی غلطی تھی۔ ہمیں پورے راستے میں شمال سے مشرق کی طرف چلنے والی ہوا کا سامنا رہا۔ ہوا کے رخ کی مخالفت سے کئی مشکلات پیش آئیں، ہمارا سفر آسان ہو سکتا تھا۔ لیکن بنیادی غلطی کے باعث ہمیں بے شمار مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم نے لیو بز ہوانگ سے سفر کا آغاز کیا ہوتا اور مغرب کی طرف بڑھتے تو ان مشکلات سے فوج سکتے تھے، جواب تک ہمارے پلے پڑی رہیں اور آخر میں ریتیلے پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ تم نے مغرب سے مشرق کی طرف کا راستہ کیوں اختیار کیا، دوسری جانب کے راستہ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟“

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے اور یہ بھی ہے کہ جو منصوبہ میں نے بنایا اس میں کوئی منطق نہیں تھی۔ سیون ہیڈن نے مارکیٹ سے مزارتاگ کا جو راستہ اپنایا اور اس کی جور و داد لکھی میں اس سے متاثر ہوا اور سوچا کہ اگرچہ ہیڈن نے اس راستے صحراء عبور نہیں کیا تھا، تاہم یہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔

صحراء کیلئے عبور کرنے کے ضمن میں سب بڑی مشکل ایک تو احساس تھا ان سے نجات پانے کی ہوتی، دوسرے سخت جسمانی مشقت کرنا پڑتی۔ ایک آدمی چھ فٹ گہر اور چھ فٹ چوڑا کنوں کھود کر اکیلے پانی نکال سکتا ہے؟ دن بھر کے سفر اور ادنوں کو اوپر نیچے ٹیلوں پر گزارنے کے بعد کنوں کھونے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ کیرولین نے ایک بار کہا تھا کہ ذہنی مشقت، جسمانی مشقت سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ ذہن کو مرتعز کرنا اس کی طاقت کو، جسمانی حالت سے یا جو کچھ تم کر رہے ہو، اس سے ہٹانا بے حد مشکل ہے۔ مسافت کے طویل دنوں کے دوران میں ذہن کو مصروف رکھنا، چیلنج کا درجہ رکھتا تھا۔ ریوپرٹ اور میرے لیے یہ قدرے آسان تھا اس لیے کہ ہم کارروان کی رہبری کر رہے تھے۔ تاہم ایسے میں بھی مجھ پر گہرے ذہنی دباؤ کی کیفیت طاری ہو جاتی، ذہنی انتشار پیدا ہوتا۔ دن بھر کی بوریت اور یکسانیت کے سبب سے میری طبیعت گر جاتی، اس کیفیت میں جسمانی اور ذہنی کمزوری توجہ کا مرکز بن جاتی۔ ٹھنڈوں اور پیروں کے زخم اور گھنٹوں کے درد سے کیسے نجات ملے، ساری توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی اور دوا داروں کی تلاش شروع ہو جاتی۔ میرے ذہن، میرے کردار کی کمزوری تمام دوسرے خیالات پر حاوی ہو جاتی۔ ایسے میں ٹیم کے کسی رکن کے ساتھ گفتگو ہی سے اس کا ازالہ ہو پاتا۔ اگر کارروان کی رہبری کے وقت کوئی دوسرا ساتھ نہ ہوتا تو میں آئندہ کی منصوبہ کرنے لگتا یا کوئی ایسا طریقہ ڈھونڈتا جس سے انتشارِ فکر و در ہو جاتا۔ اس طویل تھاں سے پیدا ہونے والے خلجان سے نجات پانے میں آسانی ہو جاتی۔ میں نے ایسے لوگوں کے بارے میں پڑھا ہوا تھا جنہوں نے دل ہی دل میں اپنے گھروں اور باغوں کے نقشے بنائے، ان کی جزیات تک طے کیں۔ حتیٰ کہ یہ تک فیصلہ کیا کہ بھلی کے سوچ کہاں لگیں گے اور گھر سے پانی کے نکاس کا کیا انتظام ہو گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے

ماضی میں ہی پناہ ڈھونڈنے میں عافیت سمجھی۔ میں ایسے لوگوں کو مقابل رجک سمجھتا ہوں جو اپنے گرد و پیش سے لائق ہو کر آگے کی فکر کرتے ہیں۔ جیز ڈوڈن میرا پرانا دوست اور میری رجنٹ کا افسر تھا۔ اسے میں نے دیکھا کہ وہ حال کے سارے بکھریوں کو بھلا کر مستقبل کے منصوبے بنانے کی مہارت رکھتا تھا۔

میں نے لارنس آف عربیا کے راستوں کی تلاش کے دوران میں اسے شدید سردی میں آگ کے پاس بیٹھے سگریٹ سلاگاتے اور کش لگاتے ہوئے خلا میں گھورتے دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ اسے کیا مسئلہ درپیش ہے۔

”نبیں، کوئی نہیں، دراصل میں نپولین کی بواسیر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”کیا کہا، نپولین کی بواسیر!“

”ہاں، کیا تم جانتے ہو کہ واٹرلو کی جنگ کے دوران میں اُسے بواسیر کا عارضہ لاحق تھا۔ موڑخوں نے لکھا ہے کہ اس مرض نے اس کی قوت فیصلہ کو متاثر کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر نپولین نے اس جنگ میں شکست نہ کھائی ہوتی تو یورپ کی تاریخ کیسی مختلف ہوتی۔“

بدقتی سے میرے لیے تکلامکان میں اس طرح کے منفرد خیالات ذہن میں لانا ممکن نہیں تھا۔ بہر حال ہم نے ذہنی سکون کے لیے ایک اور طریقہ دریافت کر لیا۔ جس سے وقت کئی میں آسانی ہو گئی۔ ہم نے کہانیاں کہنی شروع کر دیں جو اپنے ہمراہیوں کو سناتے یادنگرنے کے بعد ان کا تذکرہ کرتے۔ لو بز ہوا گک سے روائی کے وقت جب درج حرارت منی 10 فارن ہائیٹ تھا، تیز ہوا چل رہی تھی، ریت اڑاڑ کر ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ہم نے آگے جمک کر چلانا اور کہانیاں کہنا شروع کیا۔ سب سے اچھی کہانی کہنے کا مقابلہ ہونے لگا۔

مارک شعر اور گیت کہنے میں ملکہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اس صلاحیت کی بنا پر مجھے گھنٹوں خوش رکھا اور گھنٹے کے درد کے باعث میں جو بے کلی محسوس کرتا تھا، اسے بھول جانے کا حوصلہ دیتا رہا۔ مارک نے اویجوروں کے سروں کی حجامت کے بارے میں ایک نظم لکھی، جوان حالات میں ہمیں ایک معرکۃ الارتخائیق لگی۔

سفر کے آخری سویں کے دوران میں کہانیاں کہنے کو خصوصی اہمیت حاصل رہی، کہانے کے بعد ہم، سردی سے بچنے کے لیے کپڑوں میں لپٹ کر بیٹھ جاتے تو ہر ایک سے کہانی سنتے۔ ہر ایک کا جداگانہ انداز اور طرز ہوتی۔ ستاروں بھرے آسمان کے نیچے، سرد صحرائیں بیٹھ کر ہم انتظار کرتے کہ آج کون پہلی کہانی سناتا ہے۔ کہانی کے سننے سے ہم میں یگانگت بڑھی اور ہم ایک دوسرے کا قرب محسوس کرنے لگے۔

ہمارا سفر اگرچہ ختم ہونے کے قریب تھا لیکن ریت کی پہاڑیوں کے اوپر ہوتے چلے جانے سے ہماری رفتار بہت کم ہو گئی۔ بعض چھپوں پر یہ پہاڑیاں 800 فٹ تک بلند ہیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کیرولین پیار بڑھ گئی، اسے تے اور اسہال کی شکایت تھی، جس کے باعث اس کے جسم سے پانی نچھ گیا۔

میں نے اسے کہا کہ اس حالت میں تم زیادہ دیر نہیں چل سکو گی۔ کسی اونٹ پر سوار ہو جاؤ اس نے کہا کہ ”نہیں، میں اب تک چلتی آئی ہوں، اب اونٹ پر سوار نہیں ہوں گی۔“ میں نے اسے اپنا بستر اونٹ پر رکھنے کا کہا۔ اس نے یہ بھی نہ مانا اور کہا کہ ”اس میں میری دوا میں ہیں۔ اگر یہ کسی اونٹ پر رکھ دی گئیں تو ضرورت کے وقت انہیں کیسے نکالا جائے گا۔ اس لیے یہ میرے پاس ہی رہیں تو اچھا ہے۔“ میں کیرولین کی ہمت اور برداشت سے بہت متاثر ہوا۔

میرے اپنے پاؤں زخی تھے۔ بوٹ پہننا مشکل تھا، ان کے سب سے تکلیف بڑھ جاتی۔ میں نے جرابوں سے گزارا کرنا چاہا لیکن دونوں بعد وہ پھٹ گئیں۔ ٹھنڈی ریت پر، نیگے پاؤں چلتا مشکل تھا۔ میں نے بوٹوں کا ایک جوڑا جو مجھے نیک تھا، اندر سے کاٹ پیٹ کر پہن لیا۔ پہلے تو آرام ملا لیکن جلد ہی ان کی نیگی کاٹنے لگی۔

کیرولین کی حالت خاصی بگڑ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی کیسے مدد کی جائے۔ صحراء کا سفر ختم ہوا تو میرے پاؤں چند دنوں یا ہفتوں کے بعد ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن کیرولین کا کیا ہو گا؟ وہ مسلسل تے کر رہی تھی، اس میں تو انہی کا ختم ہو گئی تھی۔ میں بھی سخت لاغر ہو گیا تھا۔ میری یہ حالت تھی کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ صحرائیں پہلے میری حالت اتنی پتلی اور بڑی نہیں ہوئی تھی، مُرے مُرے خیال آنے لگے۔ اس مرحلے پر منا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں یہاں کا سوچتا، جس نے

میرے تین بیٹوں کو میری عدم موجودگی میں سنبھالے رکھا۔ کارروان آہستہ چل رہا تھا۔ کریم کی قطار کے ایک اونٹ نے اپنا سارا سامان ایک اونچے ٹیلے پر گرا دیا۔ لیکن اس طرح کہ جس رسم سے بندھا ہوا تھا، وہ نہیں کھلا۔ اونٹ بہت زور لگا کہ اس میں سے نکلا لیکن ٹیلے کے ایک طرف لڑک گیا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے پیٹھے تو مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں لیٹ جانا اور سو جانا چاہتا تھا۔ سہ پہر کو کارروان کی رہبری میرے ذمے تھی۔ روپرٹ اور مارک نے کہا کہ وہ میری جگہ لینے کو تیار ہیں لیکن میں نے سوچا کہ اپنے ذمہ کا کام خود ہی کرنا چاہیے۔ اس کا طبیعت پر اچھا اثر ہو گا۔ ٹیلے پر سے اترتے ہوئے مجھے سائس لینے میں دشواری محسوس ہوئی۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میرے نقشے پر دکھایا گیا تھا کہ جس راستے پر ہم جا رہے ہیں، آگے چل کر وہ ہمیں ہموار زمین پر پہنچا دے گا۔ ہم ریت کے ٹیلوں میں اس طرح گھرے ہوئے تھے جس طرح سفر کے آغاز میں گھر گئے تھے۔ ریت اتنی باریک تھی کہ اونٹ اس میں گر کر اٹھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جتنا زور لگاتے، دھنٹے چلے جاتے۔ گیو کا کہنا تھا کہ ہمارا نقشہ سراسر غلط تھا۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا تو کبھی یہ راستہ اختیار نہ کرتے اور پورے کارروان کی زندگی داؤ پرنہ لگاتے۔ ابھی ہمیں 118 سے لے کر 160 میل کا سفر طے کرنا تھا۔ ہمارے پاس صرف بارہ دن کی رسدرہ گئی تھی۔ اس اعتبار سے ہم کو 11.3 میل یومیہ کے حساب سے چلتا ہو گا، جبکہ ہم یہ فاصلہ طے کر سکیں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟



باب 18

موت کا کمپ

11 نومبر تک آسودہ خاطری کے تمام احساسات مکمل طور پر ختم ہو گئے۔ سامنے حد نظر تک بلند ٹیلوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ مزار تاغ جاتے ہوئے جو ٹیلے عبور کرنے پڑے تھے، یہ ان سے کہیں زیادہ برے تھے۔ پہلے جن ٹیلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اونچے ضرور تھے لیکن ان کی چوٹیاں، ڈھلان میں ڈھل گئی تھیں۔ لیکن اب جو ٹیلے درپیش تھے ان کی ریتی دیواریں عمودی تھیں، ان میں سے ہو کر گزرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ تا تر ٹنگ سے مہم کوشمال کی طرف لانے کو جو خطرہ پیش آ رہا تھا اس کے لیے میں اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اونٹ مجبوب نہیں تھے، انہوں نے 1,000 لڑپانی، تیرہ دن کے لیے اونٹوں کی اپنی خوراک اور ہماری اشیاء اٹھا کر چلنا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ سیپلائرٹ سے پیغام رسانی کا سلسلہ ختم ہو گیا، دوسرا ساز و سامان بھی کچھ زیادہ کار آمد نہیں تھا۔ اس میں سے پیشتر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا۔

ہم بہت تھک گئے تھے۔ میری غلطیاں اور بے محل جرأت مندی، میرے لیے سخت پشیمانی کا موجب تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سارا سامان ایک جگہ ڈال کر، ٹیلوں میں سے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھے، کسی صورت نکل بھاگوں۔ میرے اعصاب پر بہت بوجھ تھا۔ کارروان بہت سُست روی سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں ریت کے ٹیلے تھے، جن کو عبور کرنا سخت مشکل تھا، اس بنا پر چینیوں نے اختلاف کا بوللا

اٹھار کرنا شروع کر دیا۔

اونٹ کمزور ہو گئے تھے، ان کے لیے چلتا دو بھر ہو گیا تھا۔ نرم ٹیلوں پر چڑھنے میں انہیں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ان کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ سارباں انہیں مجبور کرنے کے تمام حربے آزمار ہے تھے۔ اونٹوں کے درمیان جو رے بندھے تھے، ٹوٹ گئے، سامان نیچے لک گیا اور اونٹوں کی ٹانگوں سے ٹکرانے لگا۔ اونٹوں کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹ سی گئی تھیں اور منہ کھل گئے تھے۔ وہ درد اور سراسیکمی کے سبب سے زور زور سے کراہنے لگے تھے۔ جو سامان ریت پر گر گیا تھا، اسے سمنئے اور اونٹوں پر لادنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ سفر میں رکاوٹ پڑ گئی تھی، شام ہونے گئی تھی، کہاں پڑا و کیا جائے؟ اس کے لیے کوئی مناسب جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اونٹوں کے لیے پانی نہیں تھا اور آگ جلانے کے لیے لکڑیاں بھی نہیں تھیں۔ ہم نے ناچار ایک جگہ ڈیرہ ڈال دیا۔ اس شام کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گیو کو دانت کا شدید درد تھا، کیرولین نے دوا تو دی لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ کیرولین کی اپنی حالت قدرے سنبھلی اور وہ اونٹوں کے رخموں پر مرہم لگانے کے قابل ہو گئی۔ میری ہڈیاں تک تھک گئی تھیں، میں سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اپنے سلپینگ بیگ میں پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس رات ایک اونٹ آوارہ ہو گیا، وہ ایک ٹیلے پر سے گر گیا۔ ہم نے اسے کھڑا کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ دو گھنٹے کی تک دو دو کے بعد بھی کامیاب نہ ہوئے۔ اونٹ کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ بے آب ٹیلوں اور میلوں کی مسافت کے خیال نے مضطرب رکھا۔

دوسری صبح کمپ پر اُداسی کا پھرہ رہا۔ ہم نے اونٹوں پر سامان لادا، سیلماں نے زخمی اونٹ کو ذنم کیا۔ اس کے بعد اس نے اور امیر نے اس کی کھال اتاری، گوشت کو مناسب لکڑوں میں کاٹ کر، راستے کے لیے رکھ لیا گیا۔ اونٹ کو پیش آنے والے حادثے، اس کے ذنم ہونے اور لکڑوں میں بٹ جانے کو دوسرے اونٹوں کی نظروں سے بچانے کی بہت کوشش کی، تاہم انہوں نے اپنے ایک ساتھی پر گزرنے والی واردات کسی حد تک دیکھ لی تھی۔ اس کا ان پر یہ اثر ا ہوا کہ ان کی حرکات ماند پڑ گئیں۔

چینی میرے ساتھ نظریں ملانے سے گریز کرنے لگے۔ شاید وہ اونٹ کو پیش آنے والے حادثے کے لیے مجھے ذمہ دار سمجھتے تھے۔ گیو نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم اس طرح چلتے رہے تو مزید اونٹ کھو دیں گے، انسانی جانیں ضائع ہونے کا بھی امکان ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں پتہ تھا کہ سفر کے دوران میں ہمیں کچھ اونٹ کھونے پڑیں گے۔ یہ خطرہ بہر حال موجود تھا۔ رات کو جو کچھ ہوا وہ حاضر تھا۔ حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ یہ حادثہ ایسے وقت ہوا جب ہم سفر مکمل کرنے کے قریب ہیں۔ گیو بولا کہ ہمیں مزید اونٹ نہیں کھونے چاہئیں۔ دودن سے پانی بھی نہیں ملا۔ آگے ملنے کا بھی امکان نہیں۔ میں نے گیو کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کامیابی کے لیے ہمیں مزید اونٹوں کی قربانی دینا پڑ سکتی ہے۔ ہماری ہم کوئی جاپانی ہم نہیں، یہ عظیم ”برلش چائیز“ ہم ہے، اس میں پس پائی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ تم حوصلہ نہ ہارو، سب اچھا ہو جائے گا۔

وہ بہت ڈر گیا تھا۔ میں نے اسے اس معاملہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا، جو میں نے مارکیٹ سے صحراء میں داخل ہوتے وقت باری سے کیا تھا۔ یہ اس نے پوچھا تھا کہ کتنی جانیں ضائع ہونے پر تم ہم کو ختم کر دو گے۔ میں نے اس سوال پر بہت غور کیا تھا۔ بیجنگ میں برطانوی سفارت خانے کے افراد سے اس مسئلے پر بات ہوئی تھی کہ ہم کے دوران میں جو جانیں ضائع ہونی تھیں ان کی میتیں لانے کا کیا بندوبست ہو گا۔ میرا موقف تھا کہ ایک فرد کی ہلاکت کے بعد ہم ہم جاری رکھیں گے، دوسرا رکن کی موت کے بعد صورت حال کا جائزہ لیں گے۔ اگر اموات کسی حادثے کے سبب سے ہوئیں تو صحراء عبور کرنے کی مہم کو ختم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔ اگر ایک یا دو موتیں بھوک اور پیاس کے باعث ہوئیں تو پھر ہم جنوب کا رخ کریں گے اور رسد کی رسائی کے پہلے مقام سے ہم ترک کر دیں گے۔ ایک سوال یہ تھا کہ مرنے والوں کی میتیں کیا کیا جائے گا، دوسویں کے فالے پر ہیلی کا پڑ تو موجود ہو گا لیکن کیا وہ ہم تک پہنچ پائے گا۔ ہم کہاں ہیں؟ اس کا تعین کر سکے گا؟ اسے ناممکن دیکھ کر بھی طے کیا کہ میت کو اونٹ پر رکھ لیں گے اور جب تک وہ اچھی حالت میں رہی اسے لیے چلتے رہیں گے۔ ورنہ اسے دفن کر دیں گے اور وہاں نشان لگا دیں گے۔ ہم نے یہ باتیں ہم کے آغاز پر ہی طے کر لی تھیں۔ البتہ چینیوں اور سارے بانوں سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

میں نے 12 نومبر کی صبح تک ریت کے ٹیلے پر چڑھائی کے دوران میں مژ کر دیکھا، اونٹ کی نقش ریت پر پڑی تھی، اس کے گرد خون پھیلا ہوا تھا۔ اگر صمرا میں گدھ ہوتے تو اونٹ کی نقش پر ضرور جھینٹ لیکن وہاں کوئی گدھ نہیں تھا۔ نقش کے پاس پانی کے دو خالی کنٹیز پڑے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگلے 130 میل کی مسافت میں ہمیں اور کتنے مردہ اونٹ دیکھنا پڑیں گے۔ ہمیں جو چیلنج درپیش تھا اس کے پیش نظر قیاس کیا جا سکتا تھا کہ مستقبل اپنے بطن میں ہمارے لیے کیا لارہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ خدا نہ کرے کہ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔

سیوں ہیڈن کو جو کچھ پیش آیا، اس کا خیال بے حد روح فرسا تھا۔ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں زندہ اونٹوں کو پیچھے چھوڑا اور خود آگے نکل گیا۔ لیکن ہم نے زخمی اونٹوں کو ہلاک کرنا مناسب سمجھا، انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنا ایک ظالمانہ فعل تھا۔ ہم نے اسے عمداً ترک کیا۔ اگر راستے میں بلند ٹیلے ہی پھیلے ہوئے اور ہمیں کہیں پانی میسر نہ آیا تو صورت حال سخت تکلیف دہ ہو گی۔ ہم طویل سفر میں مشکلات کے پہاڑ اور گھاٹیاں عبور کرتے یہاں تک آپنچے تھے۔ میں نے ڈائری میں لکھا ”اس سارے عرصے میں ہمیں کوئی بہت بڑا حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ہم اس روز 5 یا 7 میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ سب ایک دوسرے سے زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ کیرولین کمزور ہو گئی تھی لیکن چل رہی تھی اور اس نے اپنا بیگ اٹھایا ہوا تھا۔ اونٹ دو تین بار گرے اور کمزوری کے باعث پھرنا اٹھ کے۔ زہاگر دیکھتا رہا لیکن اس نے انہیں اٹھانے میں کوئی مدد نہیں کی۔ وہ فضول اور بڑا بولا شخص ہے۔ کسی کام کا نہیں، سارا بان گرے ہوئے اونٹوں کو اٹھانے والوں میں پیش پیش رہتے۔“

چینی جنوب کی طرف دریائے قرقان کی وادی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں اگر ہم موجودہ راستے پر ہی چلتے رہے تو سب ہلاک ہو جائیں گے۔ اونٹوں کو آج تیسرے دن بھی پانی نہیں ملا۔ پرانی لکڑیاں بھی کہیں نظر نہیں آ رہیں۔ ”نیا“ کے قریب موت کی وادی اور ابتدا میں پیش آنے والے ریتلے ٹیلوں سے بھی یہ زیادہ ویران قطعہ ہے۔ جسمانی لحاظ سے بہتر اور تو انہوں کرنے کے باوجود رفتار نہیں بڑھائی جا سکی۔ ڈھلوان ٹیلوں پر چڑھنے کے لیے پورا زور لگانا پڑتا۔ اونٹوں کو کھینچنا،

اضافی مشقت تھی۔ سب سے اوپرچے ٹیلے پر پڑا دکیا، اس کی اونچائی 2,000 فٹ کے قریب ہوگی۔ میرا سلپنگ بیگ گز شتر رات کی کہر میں گیلا ہو گیا تھا۔ وہ اب تک ویسا ہی ہے۔ اس میں سونا اور آرام کرنا ممکن نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ہم اس طرح کب تک مشکلات کا سامنا کرتے رہیں گے۔ دونوں میں اونٹ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔ ریت کے ٹیلوں میں کمی ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ مجھے بالآخر مانا پڑے گا اور جنوب مشرق کی طرف بڑھنا ہوگا۔ اس جانب ٹیلے قدرے ہموار ہیں اور کنوں کھودنے کا بھی امکان ہے۔ مجھے اپنی رفتار اور اونٹوں کی کمزوری کے بارے میں تشویش ہے۔ ہم پھر رہے تھے۔ اس کی کوپورا کرنے کی ہم میں قوتِ ارادی بھی نہیں تھی۔ برطانوی ٹیم کے سبھی ارکان جان مار کر محنت کر رہے تھے۔ یہ ٹیلے مارکیٹ اور مزار تاغ کے درمیانی عرصے میں پیش آنے والے ٹیلوں سے کہیں زیادہ بڑے تھے، لیکن ہم میں کچھ کردا کھانے کا جذبہ موجود تھا۔ ہر میل، تین میل کے برابر لگ رہا تھا۔ ہم بڑھ رہے تھے لیکن ہم جتنے بڑھتے، منزل ہم سے اتنی ہی دور ہوتی محسوس ہوئی۔ اوپرچے ٹیلے، ان کے رنگ، اشکال، ان کے سائے، سبھی کچھ پُر شکوہ دکھائی دیتا۔ صحراء کی وسعت میں ہمارا چھوٹا سا کارروان راستہ بناتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ایک اونٹ کے پیچھے ٹلتے ہوئے، اس کے کچاوے سے خون رستا دیکھا تو خیال آیا کہ یہ اس اونٹ کا خون ہے جس کا گوشت ہم نے زادِ سفر کے طور پر سنبھال رکھا ہے۔

اس رات میں نے روپرٹ سے کہا کہ وہ زہانگ بہا سے مل کر تمام اونٹوں کے کچاوول کا معائنہ کرے، جو سامان فالتو یا جو خوارک اب استعمال کے قابل نہیں، اسے الگ کر دے۔ دن میں پیش آنے والے تجربات سے ثابت ہو گیا تھا کہ اونٹ بھاری بوجھ اٹھا کر، ٹیلوں میں سے نہیں گزر سکتے۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنا پڑے گا۔ میں نے دیکھا کہ سامان میں اضافہ چینیوں کے حصے کو پست کرنے کا موجب ہوتا تھا۔ ریت کے پہاڑوں پر ہماری حالت بہت پتلی ہو گئی تھی۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بہت مشکل لگتا، اسے کرنے کے لیے خاص اسازوں کا لگانا پڑتا۔ بات بات پر غصہ آنے لگتا اور نوبت تو تکاریک پہنچتی۔ وہ ضبط جو لوگوں کو باہم ملائے رکھتا ہے، ختم ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر کوئی خاص طور پر، چینی آفت ڈھانے پر تلمے ہوئے ہیں۔ ایسیور

فاصلہ برقرار رکھتے آئے لیکن بعد میں فاضل اشیا کی لوٹ مجھی تو انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے فساد پا ہو گیا ہو۔

دریں اشمارک نے بڑی مشکل کے بعد ریڈ یو پرفرانس سے رابطہ کر لیا۔ وہ 170 میل جنوب مشرق میں، روپی کیا گنگ کے قریب تھا۔ بارنی کی عدم موجودگی میں فرانس ہی امدادی ٹیم کا سربراہ تھا۔ بارنی ارجمند گیا تھا تاکہ چینی حکام سے بات چیت کر کے، ہمارے چین سے نکلنے کا بندوبست کر سکے۔ چینی نہیں چاہتے تھے کہ ہم اپنی دو گاڑیوں کو ہانگ کا نگ لے جائیں اور وہاں جہاز کے ذریعے واپس انگلستان پہنچا دیں۔ ہمیں اس مسئلے پر چینی حکام نے کوئی چار مینے تک الجھائے رکھا۔ سرایڈ ورڈ ہیچہ کے چینی حکام کے نام خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ بارنی نے ذاتی کوشش سے مسئلہ سلیمانا چاہا۔ گاڑیوں کو چین سے لے جانے کے جو مقابل راستے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ گاڑیوں کو خجرا ب لے جایا جائے اور شاہراہ ریشم سے پاکستان پہنچا دیا جائے۔ لیکن خجرا ب کا درہ سرما میں برف باری کے باعث بند ہو جاتا ہے۔ بر قافی تودے گرنے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سارا ساز و سامان اگلی بہار تک خجرا ب میں رکھ دیا جائے۔ اس صورت میں ڈر تھا کہ چینی گاڑیوں کو ریغال بنا کر رکھ لیں گے اور ہم سے زیادہ پیسے بھوریں گے۔ وہ ایسا کرنے کے اہل تھے۔ میں نے صورت حال سے مایوس تھا اور جانتا کہ آگے ہمیں کیا پیش آنے والا ہے۔ مارک نے کہا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، ہونے دو۔ تم 23 نومبر تک لیوبز ہوانگ پہنچو کیونکہ ارجمند اور روپی کیا گنگ کی تقریبات وہیں طے پائیں گی۔ مجھے یہ ماننے میں تامل ہوا۔ میں نے مارک سے پوچھا کہ امدادی ٹیم کو اس سلسلے میں کچھ پتہ ہے؟

نہیں، انہیں پتہ نہیں ہے۔ ہم اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔ لیکن آئندہ بارنی سے تمہاری بات ہوتا سے ہماری مشکلوں کے بارے میں ضرور بتانا اور اسے کہنا کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو وہ چینیوں سے مل کر ہماری ہنگامی مدد کا کوئی بندوبست کر لے۔ میں پہ مشکل آخری فقرہ پورا کر سکتا تھا کہ ریڈ یو کی بیڑی جواب دے گئی۔

کریم دو گھنٹے سے لاپتہ تھا۔ ایک چینی نے اسے جنوب کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ اندر ہیرے میں وہ ہم تک پہنچ پائے گا؟ شام کو کھانے تک اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ آگ جلا کر دیکھیں شاید کریم کو نظر آجائے۔ ہم نے اس کا نام بھی پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ آدھ گھنٹے بعد آگ کے شعلے بلند کیے۔ ہم نے دیکھا کہ کریم ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھا رکھا تھا جب ہمارے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ لکڑی کا گنگھا اٹھا لایا ہے۔ کیرولین نے کہا کہ کریم کو داد دینا پڑتی ہے وہ آگ جلانے کی خاطر، لکڑی تلاش کرنے چلا گیا تھا۔ کریم نے کہا کہ ہم جہاں ہیں یہاں سے دو گھنٹے جنوب کی طرف چلیں تو کواؤ ہودنے کے لیے مناسب جگہ مل سکتی ہے۔

کریم کی لائی ہوئی لکڑی سے ہم نے آگ جلائی اور تمام لوگ اس کے گرد دائرة بننا کر پیٹھ گئے۔ امیر اور سلیمان نے اونٹ کے گوشت کے پارچے لکڑی کے لکڑوں میں پروکر آگ پر پکانے شروع کیے۔ مارک نے کہا کہ ”یہ اونٹ کے کباب ہیں۔“ سو یہ اس اونٹ کا انجام تھا جو 48 ڈنوں تک ہمارے لیے پانی اٹھائے لاتا رہا۔ یہ تازہ گوشت پہلی بار میسر آ رہا تھا۔ آئندہ کب ملے گا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چینیوں کو اونٹ کے کباب پسند نہیں آئے، روپرٹ اور مارک بھی مذاق میں مصروف ہو گئے۔

دوسری صبح کو سات بجے کے قریب ستارے ابھی تک چک رہے تھے۔

قرہ میٹر پر فارن ہائیٹ منٹی 20 درجے تھا۔ کنٹیزروں میں پانی جم گیا تھا۔ سلپینگ بیگ کہر کے باعث بوچل ہو گئے تھے۔ اونٹوں کے لیے پانی نہیں تھا اور آگ تاپنے کے لیے لکڑی نہیں تھی۔ 120 میل کا فاصلہ طے کرنا باتی تھا۔ لاوزہاؤ پرول کا چوڑھا جلانے میں مصروف تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ ایک کیتی میں پانی گرم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے ایک پیالی کافی تیار کی۔ صبح کا نظارہ کرنے کے لیے سب سے اوپھی چوٹی پر چلا گیا۔ مارک پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ وہ ایک ٹین میں دلیہ کھارہا تھا۔ اس تک پہنچتے پہنچتے کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ میں نے کہا کہ میں تمہاری تہائی میں مداخلت تو نہیں کر رہا؟ اس نے جواب میں اپنا سرفی میں ہلا�ا اور کہا تمہارا آنا اچھا لگا۔

منظرا کتنا جاذب نظر ہے۔ یہ کبھی نہیں بھلا�ا جا سکے گا۔ کیون لیون پہاڑ پورے افق پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے اور پہاڑ کے درمیان ریت کے ٹیلے ہیں۔ اونچے اور چھوٹے، مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے۔ میرے عقب میں اور یونچ کیمپ میں زندگی

کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ ایغور ایک صفحہ میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔ جس سمت میں ہمیں اگلی منزل کے لیے کوچ کرنا ہے، اس کے راستے میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی دکھائی دے رہی ہیں جو ہماری رفتار کو سُست کرنے کا موجب ہوں گی۔ پانی کے لیے کنوں کھودنے کا امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مارک نے میرے خدشات کا اندازہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا سوچ رہے ہو، میں نے کہا کہ ہمیں دو دن مزید چلنا ہو گا۔ اس کے بعد ہی صحیح اندازہ کیا جاسکے گا کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ اس نے کہا کہ سنجیدگی سے غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ہمیں ابھی کھٹکن جدو چہد کرنا ہو گی۔ اونٹوں کی حالت دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ منزل تک راستی آسان نہیں۔ دو دن مزید پانی نہ ملا تو مزید اونٹ پیاس سے مر جائیں گے۔ اصل ڈر اس بات کا ہے کہ ہم ایک دن میں مشکل سے چھ میل فاصلہ طے کر سکیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم سے کوئی بھی موجودہ حالات کو مزید ایک دن کے لیے برداشت کرنے پر آمادہ ہو۔

مارک خاموش تھا۔ میں نے جنوب مشرق کی طرف دیکھا، ٹیلوں کے درمیانی نشیب و فراز نظر نہیں آ رہے تھے لیکن بہت پرے کی سطح تدرے ہموار تھی۔ میں نے شمال مشرق اور مشرق کی طرف دوبارہ دیکھا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ جنوب مشرق کی طرف جانا زیادہ بہتر ہے۔ اس پر چلتے رہنے میں آسانی رہے گی۔ مارک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا کہ میں ایک بات کہے دیتا ہوں، تم اس پر غور کر لیتا۔ یہ کہ ایورسٹ کو پہلی بار سر کرنے والوں نے سب سے مشکل راستہ نہیں چنا تھا، ہم بھی ایک مشکل ترین صحرائ کو عبور کرنے کا تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں اور جنوب مشرق کی جانب کا راستہ صرف اس لیے اختیار کر رہے ہیں کہ پانی مل جائے گا اور کچھ کم فاصلہ طکرنا پڑے گا۔ لیکن آخری نتیجہ پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ میں نے مارک سے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم جنوب مشرق کا راستہ اختیار کریں گے۔ تم ابھی اس ٹھمن میں کسی سے بات نہ کرنا۔

کیمپ میں واپس پہنچنے تو روپرٹ نے بتایا کہ چینیوں کو فاضل سامان پھیک دینے پر آمادہ کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ ان کے مقابلے میں برتاؤ کی ارکان نے خوش دلی سے بہت سا سامان جس میں خوراک شامل تھی، چھوڑ دیا تھا۔ میں نے

ریپورٹ سے کہا کہ وہ ٹیم کے سبھی ارکان کو صرف دس دن کاراشن لے جانے پر آمادہ کریں۔ ریپورٹ کی رائے تھی کہ اس کے لیے گیو سے بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کا کہنا شاید موثر ہو۔ میں نے گیو سے بات کی، اس پر خاصی تکرار ہوئی۔ گیو غصے میں پاؤں پتختا چلا گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور ان سے کچھ کہنے لگا۔ میں نے مارک سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مارک کا جواب تھا کہ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہتا ہے۔

اس نے کیا کہا، اس سے قطع نظر ہم نے دیکھا کہ چینیوں نے ڈبہ بند خوراک، بزریاں، چاول پھینکنا شروع کر دیے۔ گیو نے ان چیزوں کے انبار پر پڑوں چھڑکا اور آگ لگا دی۔ المخیروں کا رد عمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ برطانوی اور چینی ارکان کے اختلاف پر خوش تھے۔ لیکن دوسرے معاملات پر خاصے پریشان تھے۔ انہیں بادل خواستہ ہمارا فیصلہ ماننا پڑا۔ گیو نے اونٹوں کے کچاوے دیکھے اور کہا کہ برطانوی ٹیم اپنے ساتھ بسکٹوں کے اتنے زیادہ باکس کیوں لیے جا رہی ہے۔ میں نے بسکٹ کھول کر ڈھیر کر دیے جنہیں دیکھتے ہی اونٹ لپکے اور انہیں ہڑپ کر گئے۔ گیو اور اس کے ساتھیوں پر کھل گیا کہ بسکٹ اونٹوں کے لیے تھے۔ بچا کھچا سامان سنبھالنے اور اونٹوں پر لادنے میں تین گھنٹے لگ گئے، اب ریتلے ٹیلوں میں مزید ایک دن کا سفر درپیش تھا۔ اس کے دُشوار ہونے کے احساس نے ہر ایک کو مر جھادیا تھا۔ جنوب مشرق کی طرف کا راستہ آسان نہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آگے کے ایک سو میل سے تکلامکان اپنے کون سے راز ہم پر منکشف کرے گا۔



باب 19

بدشگونی

ہماری مہم کے راستے کے بارے میں چینی حکام خاص طور پر حساس تھے کیونکہ یہ تکلامکان کے مشرق میں لوپ نو صحرائیں سے گزرتا تھا، جہاں چین کے ایٹھی تجربات ہوتے ہیں۔ روی اور مغربی ممالک اس سے باخبر تھے۔ گزشتہ صدی میں روس اور برطانیہ نے وسطی ایشیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کی تگ و دو کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی قومی سرحدوں کے تحفظ کے لیے ایٹھی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی دھمکیاں بھی دی جانے لگیں۔ جن کے سبب سے وسطی ایشیا کے گرد قومی مفادات کا توازن بگز گیا۔ سنیا نگ کی سرحدیں پاکستان، انڈیا اور سابق سوویت جمہوریتوں سے ملتی ہیں، جو ایٹھی صلاحیت حاصل کرچکی ہیں یا حاصل کرنے کے قریب ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ چین کا ایٹھی تجربات کا علاقہ ہمارے مشرق میں تھا۔ ہمارے سفر کے آغاز پر وزارت دفاع نے ہمیں اس کے بارے میں عمومی طور پر بتا دیا تھا۔ چینی محکمہ سراج رسانی کو علم تھا کہ ہماری مہم کے تین اركان کا تعلق برطانوی فوج سے ہے اور وہ سابق فوجی بھی ہیں۔ وہ ایک ایسے صوبے میں مہم جوئی میں مصروف رہے ہیں، جہاں حال تک کسی غیر ملکی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہماری مہم کی چینی ٹیم میں کیوالائی کو جاسوسی کی غرض سے ہی شامل کیا گیا تھا۔ ستر کے پہلے ہفتے جب ہم مزارتانگ سے گزر رہے تھے تو سنا کہ لوپ نو صحرائیں ایٹھی دھماکہ کیا گیا ہے۔ باری نے ہمیں اس کی اطلاع ریڈیو پر دی تھی۔ چینیوں نے بعد میں کہہ دیا کہ انہوں نے کوئی دھماکہ نہیں کیا۔ پہلیں کو بتایا گیا کہ المغیور

ری پلک میں ززلہ آیا ہے۔ میرا کہنا تھا کہ لوپ نو میں جہاں ایسی دھماکہ ہوا، ہم اس سے ایک ہزار میل دور تھے اور جہاں ہوا شمال مشرق کے رخ پر چل رہی تھی۔ ہمیں مستقلًا بتایا جاتا رہا کہ عالمی برادری کو اس علاقے میں گہری دلچسپی ہے، رات کو آسمان پر جو سیلانٹ (معنی سارے) اڑتے نظر آتے ہیں، وہ اس کی واضح دلیل ہیں۔ بارنی کی ٹیم، صحرائے فاتحانہ اخلاکی تیاری اور مقامی تقاریب کے انقاد کے لیے روکیا گئے قبیے میں چل گئی، جو 680 میل جنوب مشرق میں، جنوبی شاہراہ ریشم کے مشرقی سرے پر اور تکلامکان کے پہلو میں واقع ہے اور اس علاقے کا آخری نخلستان ہے۔ یہاں سے سڑک جس کی حیثیت محض پگڈنڈی کی سی ہے، لیو بز ہوا گئی شمال کی طرف نکل جاتی ہے اور تکلامکان اور لوپ نو صحرائے جانے والی سڑک میں بٹ جاتی ہے۔ نقشہ پر لیو بز ہوا گئے قبیے کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ لیکن جب بارنی اپنی گاڑیاں لے کر پہنچا تو وہاں چند عمارتوں کی باقیات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کسی دور میں یہاں فوج نے قبضہ کیا تھا اور یہ عمارتیں اس کے تصرف میں رہی تھیں۔ یہاں ززلہ پیمانی کے آلات اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے مہی اندازہ کیا گیا کہ یہ انجام ایسی دھماکے سے پیدا ہونے والے ارتعاش کو ماپنے کے لیے کیا گیا ہوگا۔ یہاں صحراء، چھپا اور ہموار تھا۔ ریت کے نیلے بھی نہیں تھے۔ بارنی اور اس کے ساتھی کیتھے نے یہاں پہنچ کر عجیب قسم کی بے چینی اور بے کلی کی اطلاع دی۔ فرانس کا کہنا تھا کہ اگر ہمارے پاس ریڈیائی اثرات جاپنے کا آلہ ہوتا تو ان کا جائزہ لینے کے لیے یہاں کچھ وقت گزارا جاسکتا تھا۔ ہم نے واپسی پر ایسی تجربات کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اپنی مہم کے ذکرے پر ہی اکتفا کیا۔ ایسی تجربے کا ذکر آتا تو سمجھا جاتا کہ صحرائے جور کرنا تو بہانہ تھا اصل میں ایسی تجربات کا پتہ چلا نا اور ان کے بارے میں تصدیق کرنا تھی۔ اونٹ جس رات ذبح کیا گیا چینی ٹیم نے سرتائبی کا اظہار شروع کیا۔ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔ ہم 680 میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور ابھی ایک سو میل کا فاصلہ طے کیا جانا تھا۔ کشیدگی اس سارے عرصے میں موجود تھی لیکن اس کا واضح اظہار نہیں ہوا تھا۔ البتہ وہ جس انداز اور شدت سے بڑھتی آ رہی تھی، اس کے پیش نظر کہا جا سکتا تھا کہ مختلف قومی ٹیموں میں، جو اپنے اپنے راستے سے منزل تک پہنچنے کے

لیے کوشش، اختلاف اپنہا کو پہنچ سکتا ہے۔

جس روز ہم نے جنوب مشرق کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا، اس پر اختلاف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ریت کے نیلے دشوار گزار ہوتے گئے۔ ریت نرم اور گہری تھی، اونٹ چلتے ہوئے اس میں ڈھنس جاتے۔ ان کی ناٹکیں کپکپائے لگتیں، وہ رک جاتے تو پھر مشکل سے ہی پاؤں اٹھا سکتے۔ چکارنے اور برداشت سے کام لینے کے بعد ہی انہیں چلنے پر آمادہ کیا جا سکتا۔ پہلے چھ اونٹوں کو یوسن نے بڑی جدوجہد سے اس جگہ تک پہنچایا جہاں مارک اور کیرولین ان کے منتظر تھے۔ روپرٹ اور میں آگے نکل گئے تھے۔ ہم نے سیدھا راستہ اختیار کیا تھا۔ ہم نے راستے کی سختی برداشت کی۔ لیکن سیدھے چلتے گئے۔ راستہ تبدیل کرتے تو وقت ضائع ہوتا۔ چینیوں نے غلطی کی اور راستہ تبدیل کر لیا۔ وہ کارروان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں عمودی ریٹنی دیوار پر چڑھتے دیکھ کر سارے بانوں سے کہا کہ وہ جنوب کا رخ کریں۔ مارک اور کیرولین نے انہیں راستہ تبدیل کرتے دیکھا لیکن وہ گھٹنوں تک گہری ریت میں مشکل سے قدم اٹھانے میں مصروف تھے، اس لیے انہیں کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم نے اونٹوں کو دس منٹ تک سانس لینے دیا اور پھر انہیں 60 فٹ اونچے ٹیلوں کی طرف ہنکایا، چھ اونٹوں کو یہاں کچھ دیر تھہرائے رکھا اور باقی ماندہ اونٹوں کے پیچھے کا انتظار کیا۔ ایک گھنٹا پہلے میں نے دیکھا کہ اونٹ قطا روں میں آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے جنوب کی طرف رخ کیا تھا۔ سیلیمان اور امیر نے شمال کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا، اس لیے بھی کہ کارروان دو حصے میں بٹ گیا تھا۔ دوسرے صحراء کو عبور کرنے کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ ہماری کامیابی کا دار و مدار اس پر تھا کہ وقت پر منزل تک پہنچتے۔

روپرٹ نے مجھ سے کہا کہ حالات کو بگزرنے سے بچانے کی تدبیر کرو۔ یہ جو بے قاعدگی اور بے ضابطگی کے مرکب ہو رہے ہیں انہیں سختی سے ضابطے میں لانا ہوگا۔ میں نے پورے محل سے اس کی بات سنی اور کوشش کی کہ اس مرحلے پر کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔ میں نے گیو سے کہا کہ سارا الام سارے بانوں کے سر دھرنا مناسب نہیں۔ سارے بانوں ہی پر پابندی ہے کہ وہ اونٹوں کو سیدھے انداز

سے چلاتے رہیں۔ اس نے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ یہی صورت حال رہی تو سارے اونٹ مارے جائیں گے اور کمی انسان بھی موت کے گھاث اتر جائیں گے۔ میرا کہنا تھا کہ اس طرح کی صورت حال سے ہم کمی بار پہلے بھی دوچار ہو چکے ہیں اور اس سے بہ حفاظت گزر چکے ہیں۔ راستے میں نے چنان ہے، اب اس میں تبدیلی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس نے کہا کہ تم چاہے کچھ کہو، یہ راستے تمہیں کہیں نہیں لے جائے گا، اونٹ آگے جانے کے قابل نہیں رہ گئے۔ میں نے اس کا پھر ویکھا اونٹوں کی رہنمائی کرنا آسان نہیں تھا۔ چنی اور سارے بان سخت غصے کے عالم میں تھے۔ روپرٹ نے یہ بھانپ کر کہ ٹکڑا نہ ہو جائے گیو سے کہا کہ چارلس مہم کی رہنمائی کرتا آیا ہے۔ اگر تمہیں اس کی قیادت پسند نہیں تو تم پہلے روز ہی علیحدگی اختیار کر لیتے۔ مہم کی رہنمائی، ریٹیو، طبی امداد، اخراجات، برطانوی ٹیم ہی کے ذمے رہے ہیں۔ تم نے کیا کیا ہے؟ میں نے کہا، گیو! تمام ذمہ داری برطانوی ٹیم بھاری ہی ہے۔ اونٹ ان کے ہیں، ساز و سامان ان کا ہے، سارے بانوں، حتیٰ کہ تمہیں بھی وہی معاوضہ دیتے آئے ہیں۔ گیو چپ ہو گیا، جیسے اس نے ہار مان لی ہو۔ اس کی آنکھوں سے صاف عیاں تھا کہ اس کے جذبات مجرور ہوئے ہیں۔ تکلامکان کو عبور کرنے کی مہم کا آغاز برطانوی ٹیم نے کیا تھا۔ اس نے اسے جاری رکھا اور انجام تک پہنچایا۔ ہزاروں میل دور کے ایک جزیرے سے تعلق رکھنے والی ٹیم نے اس مہم کا آغاز کیا۔ اس کی تعظیم کی، اس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے تمام اسباب کیے۔ مشکل اور ابتر حالات میں بھی مہم کو جاری رکھنے کے سارے تقاضے پورے کیے۔ چیوالی نے چند منٹ خاموش رہنے کے بعد کہا کہ اونٹ آگے گئے نہیں جاسکتے۔ میں چیخ پڑا، تم کیا جانتے ہو، تمہیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ اونٹ پر بوجھ لدا ہو تو وہ کیسا ہے اور بوجھ کے بغیر کیسا؟ اس لیے تم زبان بذرکھو۔

مارک نے سرگوشی میں کہا کہ چارلس ہوش سے کام لو، یہ نہیں چاہیں گے کہ کسی کو چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو تم رات کو سوئے ہوئے ہو اور یہ آکر تمہارا گلا کاٹ دیں۔ یہ ایک عرصے سے غصے میں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ چینیوں، سارے بانوں اور انگریزوں کے درمیان تعاون ختم ہو رہا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر گیو کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی اور کہا،

گیو، آؤ اس بک جھک سے نکل کر سگریٹ پیتے ہیں۔ ہم ہم کی قیادت کرتے آئے ہیں۔ ٹیکوں کو ایک ساتھ رکھنے کی ذمہ داری بھی ہمیں کو پوری کرنی ہے۔ اس نے ایک چھوٹے، خوف زدہ بچے کی طرح مجھے دیکھا، میں نے سگریٹ سلاگایا اور اسے پکڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس سے سخت کلامی کی۔ گیو صحیح تھا میں اسے دوست سمجھتا اور پسند کرتا تھا۔

ہم نے آخری سو میل کے دوران میں سردی بدترین دشمن تھی۔ شمال مشرق کی طرف سے سرد ہوا، ریت کے ٹیکوں پر چلتے ہوئے، ہم پر ریت کی بوچھاڑ کر رہی تھی، یوں لگتا ہے جیسے جسموں کو ڈنک مار رہی ہو۔ بعض ٹوں میں صحراء اور آسمان آپس میں اس طرح مل جاتے کہ ان کے درمیان تفریق کرنا ممکن نہ رہتا۔ ریت اور غبار ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ ہمارے جسم اس قابل نہ رہ گئے تھے کہ سفر جاری رکھ سکتے۔ اب ایک ہی خواہش تھی کہ صحیح و سالم صحراء سے نکل آئیں اور فتح یابی کا انعام حاصل کر سکیں۔ اب دن دن رہ گئے تھے، صرف دن دن۔

چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ جب ہم واپس پہنچیں گے تو ہمارا شان دار استقبال ہو گا۔ وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر گھنٹے کے بعد میں حساب لگاتا کہ ہم منزل سے کتنی دور رہ گئے ہیں۔ کتنے میل کا فاصلہ طے کیا ہے اور کتنے میل مزید طے کرنے ہیں؟ صحرائی زندگی اور معمولات کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ ان کے بغیر کوئی اور بات سوچی بھی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے ایک ٹیلے کے سامنے میں کھڑے ہو کر ریت پر ہوا کے جھوکوں کے زور سے بنی ہوئی لہروں کو دیکھا اور قدرت کی فن کاری کو سراہا۔ میں نے اپنی جیکٹ سے پلاسٹک کے تین ساشے نکالے اور ان میں ریت بھر لی۔ ان میں سے ایک پر لکھا: ”تمہارے لیے اولیور“، دوسرے پر ”تمہارے لیے جیک“، اور تیسرا پر ”تمہارے لیے ٹوبائی“۔ میں نے ٹیکوں سامنے سنجال کر رکھ لیے۔ اپنے ٹیکوں بیٹوں کے لیے یہ میرے تھے تھے۔

اگلے روز مارک نے کارروان کے آگے چلتے ہوئے ایک صحرائی لومڑ دیکھا۔ یہ پہلا اور آخری جانور تھا جو ہمیں صحراء میں اپنے طویل سفر کے دوران میں نظر آیا تھا۔ مارک بے حد خوش تھا، اس نے اس کی شکل، شباہت، رنگ غرض ہر تفصیل کا ذکر بڑے

پر جوش انداز میں کیا۔ اس نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ میں لوٹ کو دیکھ کر حیران ہوا یا لوٹ رجھے دیکھ کر۔ وہ عام کتے سے جامانت میں بڑا تھا۔ اس کی دم بھاری، کان چھوٹے، بال سفید اور پیلے تھے۔ وہ چھٹ پرے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ بعد میں وہ آرام سے چل دیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر گزدی ہوئی تھیں۔

چھوٹی موٹی بیماریاں تو سب کے ساتھ گلی ہوئی تھیں۔ عبدال اور گیو کو دانت کی تکلیف تھی۔ کیرولین نے دونوں کو دوادی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ سلیمان کو اسہال کا عارضہ تھا۔ میرا گھنٹے کا درد بڑھ گیا تھا۔ لاڈ زہاڑ پر گری کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں نے اس کی پختہ جان کی تعریف کی۔ اس نے پرانا لباس پہن رکھا تھا، پتلہ اور سوتی۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے اپنے سلپینگ بیگ پر غلاف چڑھایا تھا۔ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ ایک بڑھیا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اکھڑی اکھڑی باتیں ہم سب کے لیے ہنسی مذاق کا موجب تھیں۔

اوٹوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کچھ زخم مندل ہو گئے تھے لیکن بعض بدستور موجود تھے۔ سلیمان ایک شام ایک اوٹ کی زبان کو چھیلنے لگ پڑا، ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ زبان کی مردہ کھال کو اتار رہا ہے۔ میرے لیے اپنی ڈائری لکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ چند لفظ لکھتا تو انگلیاں سردی کے باعث جنم جاتیں اور ان کے جوڑ درد کرنے لگتے۔ پنسل کو درمیان میں رکھ کر انہیں آہستہ آہستہ دبایا جاتا تو وہ قدرے کھل جاتی تھیں۔ میرے دستانے امدادی ٹیم کے پاس رہ گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی نے مجھے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ 16 نومبر کو میں نے اپنی ڈائری میں لکھا: صبح ناشتہ کیا، موسم کے اعتبار سے دن بہت برا گزر۔ نج بستہ ہوا چلتی رہی، جس کی رفتار 40 سے 50 میل فی گھنٹا تک پہنچ جاتی۔ درجہ حرارت متغیر 10 فارن ہائیٹ تک تھا۔ پانی کے کنٹیز جم گئے تھے۔ اوٹوں کے پوپلوں اور منہ کے گرد برف کے ذرات صاف نظر آتے تھے۔ برفلی پہاڑیوں کے علاقے میں داخل ہوئے تو چند سو گز سے دور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا شور چھاتی چلتی تھی اور ہم ریت کے ٹھیڑے کھاتے جھک کر چل رہے تھے۔ سورج ریت کے غبار میں سفید ہالہ سا نظر آتا تھا۔ کچھ ریت ہوا اڑاتی تھی، کچھ اوٹوں کے چلنے سے اڑتی تھی۔

سارے بان اپنی چھڑیاں لہراتے، ہاتھ ملتے، بازوؤں کو تھپٹھپاتے اور سردی کا اثر کم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے۔ اونٹ اور انسان، عناصر قدرت کے خلاف لڑتے، اپنی منزل کی طرف روان تھے۔ وہ موت کے صحراء کو عبور کر رہے تھے۔ ہم سر جھکائے، راستے کی رکاوٹیں عبور کرتے چارہے تھے۔

شام کو گیو سے باتیں کیں، میں نے پوچھا کہ اس مہم سے اسے کیا حاصل ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ شروع میں وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جسمانی لحاظ سے صحراء عبور کرنے کے قابل ہے۔ لیکن اب میں زیادہ پُر اعتماد ہوں۔ میں گیو کا ممنون احسان ہوں، اس کے بغیر چین میں بہت سے معاملات طے نہ ہوتے۔ اس نے منصوبہ بندی کے ضمن میں بہت کچھ کیا۔ کیرولین نے اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں انگریز ثابت کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنی ذات میں گم ہو جاتی ہے۔ آج اس نے مجھے ناراض کر دیا۔ میں نے عبدال اور لوسمین کو بسکٹ پیش کیے۔ اس پر اس نے کچھی کسی جو مجھے کھائی۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے پاس اپنے بسکٹ ہیں، انہیں مزید کیوں دیے گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے علم تھا لیکن خوش غلطی بھی تو کوئی شے ہے۔ پھر یہ تفریق کا معاملہ بھی نہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کوئی کہے کہ پیر میرا اور وہ ان کا معاملہ ہے۔ صحراء میں اشتراک کرنا پڑتا ہے۔ کیرولین ویسے، بہت ہمدرد ہی۔ سب کی ضرورت کا خیال رکھتی، انہیں دوادیتی، خیال رکھتی کہ انہوں نے گولیاں کھالی ہیں یا نہیں۔ اونٹوں کے زخمیوں کو صاف کرتی ان پر دوالگاتی۔

شدید سردی کے باوجود روپوپڑ ریت کے نمونے لیتا رہا۔ اس نے سارے سفر میں ماپ تول کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ اعداد و شمار آسکفرڈ یونیورسٹی کے کام آتے تھے۔ مہم کے شروع ہونے سے لے کر اختتام کو پہنچنے تک روپوپڑ نے تمام ضروری معلومات جمع کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے قدیم آثار دریافت کیے۔ زمانے کی سختیوں سے اجڑتے ہوئے جنگلوں سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اسی طرح کئی اور دریافتیں بھی تھیں لیکن میں محسوس کرتا رہا کہ ہم بہت کچھ کر سکتے تھے اور سامنس اور جغرافیہ کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔ صحراء کو پھر کون عبور کرے گا؟ ہمیں پانی اور دوسری ضروری اشیا میسر ہوتیں تو شاید ہم زیادہ بہتر کام کر سکتے اور علمی اضافے کے محک

ثابت ہوتے۔ اصل میں زندہ رہنا بھی ایک معز کہ تھا۔ اس لیے جو کچھ بھی بن پڑا ہم نے کیا۔ ایک ٹیلے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ایک مردہ پرندہ دیکھا، وہ کب مرا، یہ اندازہ کرنا مشکل تھا، البتہ وہ اچھی حالت میں تھا۔ اس کے پر سفید تھے۔ ان پر زور دنگ چھڑ کا نظر آتا تھا۔ وہ جس حالت میں پڑا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ جب مراریت پر بیٹھا ہوا تھا یا اس نے اپنی چونخ اپنے پروں میں دے رکھی تھی۔ شاید گرمی اور تحفظ کے لیے۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ کس طرح پرندے جنوب کی جانب گرم علاقے کی طرف نقل مکانی کرتے ہوئے صحراء پر سے گزرتے ہیں، یہ پرندہ یا تو بیمار تھا یا تھک گیا تھا۔ اس لیے اڑ کر آگے نہیں جاسکا اور یہاں اتر گیا۔ پھر اس میں اڑنے کی سکت نہ رہی۔ بھوک اور موسم کی شدت کے باعث مر گیا۔ ہم صحرائیں کسی چہاز کے گرنے اور بکھرنے کی جگہ کے متلاشی رہے لیکن ہمیں کچھ نہیں ملا۔



صحراء فتح ہو گیا

جب مہم انجام کو پہنچی تو صحراء میں گزرے ہوئے صبح و شام اور ان کے دوران میں پیش آنے والے احوال نگاہوں میں پھرنے لگے۔ صحراء بدل گیا۔ ریت کے ٹیلوں کی جگہ ہمارے زمین نے لے لی۔ جس پر چھوٹے چھوٹے گول پھر بچھے اور پھیلے ہوئے تھے۔ صحراء سے نکلنے کے آخری لمحات کو، ہم اس طرح یاد نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ ایک ابر آسودن ہم ریت کے سمندر کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے جان بوجھ کر بیس میل پہلے ہی پڑاؤ کر لیا۔ ہمارے ایک طرف جبل تھا، دوسرا جانب ہمارا گھر تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم جس امتحان سے گزرے وہ ہماری یادداشت سے محو ہو جائے۔ ہم جس مقصد سے نکلے تھے، وہ پورا ہو گیا۔ ہم زندہ سلامت واپس آگئے۔ صحرائی کشش اور ساتھیوں کی رفاقت کی یاد کو ہم بھلانا نہیں چاہتے۔

پڑاؤ ڈالنے سے پہلے عبدال نے جوانٹ پر سوراخ، دور سے ایک اونٹ کو کارروان کی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچا تو وہ دو کہانوں والا، پلا ہوا تند رست جنگلی اونٹ تھا۔ اس نے ہمارے کارروان میں شامل اونٹوں کی بوپا کر پیچھا کرنا شروع کیا تھا۔ میں نے زہانگ سے کہا کہ وہ سارے بانوں سے کہے کہ وہ اس اونٹ کو پکڑ لیں۔ لیکن انہوں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ سردی نے ان کے جسموں اور روح کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ میں نے محسوں کیا کہ صحراء میں ہمارا باقی کا جو فاصلہ رہ گیا ہے وہ پہلے کی طرح طے کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ جلد از جلد لیو بز ہوا گل واپس پہنچتا چاہتے تھے۔

میں نے مارک سے کہا کہ آؤ اونٹ کو پکڑتے ہیں۔ ہم نے تیز قدم اٹھاتے ہوئے اونٹ کو گھیر لیا۔ وہ بھی میری طرف دیکھتا تھا، کبھی مارک کی طرف۔ پہلے آہستہ آہستہ چلتا رہا پھر دلکی چال چلنے لگا، اس کا رُخ ہمارے کارروان کے اونٹوں کی جانب تھا۔ جلد ہی وہ ان کے قریب پہنچ کر ایک رستے میں الجھ گیا۔ سلیمان تیزی سے اٹھا، اس نے اونٹ کی گردان میں رستہ ڈال دیا۔ کیرولین نے کہا کہ تم نے تیس اونٹوں کے ساتھ سفر شروع کیا تھا۔ اس اونٹ کے مل جانے سے تمہارے اونٹوں کی تعداد تیس ہو گئی ہے۔ ریوپرٹ بولا کہ شاہراہ ریشم پر اس اونٹ کی خاصی بڑی قیمت مل جائے گی۔

کارروان چل دیا، میں اور ریوپرٹ اس کی رہبری کر رہے تھے۔ تین گھنٹے بعد ایک سایہ دار جگہ رکے، اتنے میں قافلے کے دوسرے اونٹ بھی آپنچھ۔ لیکن ان میں جنگلی اونٹ نہیں تھا مارک نے کہا کہ شاید وہ رستہ تذاکر بھاگ گیا ہے۔ سلیمان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، اس لیے وہ دوبارہ جنگل میں چلا گیا۔ میں خوش ہوا کہ وہ ترکستان کے بازار میں نیلام نہیں ہوا۔

آخری رات آگ کے گرد بڑی سنجیدہ فضار ہی۔ ہم بہت تحک گئے تھے، طویل سفر نے ہمارے جسم سے طاقت نچوڑ لی تھی۔ لاوزہاؤ میں ہوت کی رقم باقی تھی۔ وہ ہمارے پاس آیا، اس نے جیب سے کپڑے کا ایک میلا سالکڑا انکالا، ہمارے سامنے اسے کھولا اور اپنی ہتھیلی پر پھیلا دیا۔ اس پر چمک دار پتھر تھے، جو پہلی نظر میں ہیرے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ قیمتی پتھر اس نے مزار تانگ کے قریب پہاڑ سے نکالے تھے۔ لاوزہاؤ نے ان میں سے ایک بڑا پتھر دکھایا اور کیرولین کو دیا اور کہا کہ یہ برطانیہ کی عظیم وزیراً عظم مارگریٹ تھیجر کی طرح کی خاتون کیرولین کے لیے تخفہ ہے۔ لاوزہاؤ نے کہا کہ کیرولین بھی آئرن لیڈی ہے، جو ”آئرن لیڈی آف چانٹا“ کہلاتے گی۔

اس کے بعد اس نے تین چھوٹے پتھر اٹھائے اور انہیں میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا کہ یہ ایک پاگل پروفیسر کا پاگل جزل کو تختہ ہے۔ میرے بغیر ہم کا کامیاب ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں اس تعریف سے بہت متاثر ہوا۔

نومبر کی 21 تاریخ کو، صحرائے عبور کرنے کے 59 ویں دن ہم نے اونٹوں کو آخری بار لادا بہت سا سامان ہم پھینک چکے تھے۔ جو تھوڑا سارہ گیا تھا، اسے بڑی

آسانی سے اونٹوں پر رکھ دیا گیا۔ ہم نے ٹیم کو اکٹھا کیا اور ایک دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ میرا گلا رُنڈھا ہوا تھا، میرا خواب پورا ہو گیا تھا۔ وہ میل بعد ہماری دو ماہ کی مسافت پوری ہو جائے گی۔ صحرائیں ہمارے دن پورے ہو گئے ہیں۔ صحراء ہم پر مہربان ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ مناسب ہو گا کہ ہمیں کر دعا کریں اور شکر بجا لائیں کہ ہم صحراء سے سلامت واپس آ گئے۔ صحرابجس کے نام سے ظاہر ہے کہ جو اس میں گئے جیتے جی واپس نہیں آئے۔ یہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے۔ دو ماہ پہلے ہم صحرائیں اترے تھے، آج ہم باہر آ گئے ہیں۔ تم سب کو اپنی اس کامیابی پر فخر کرنا چاہیے۔ یہ مشترکہ کامیابی ہے۔ برتاؤی، چینی اور المغیروں کی اور اونٹوں کی بھی، اونٹوں کے بغیر یہ معز کہ سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اپنے گھر میں جاؤ تو اپنے خاندان کو بتانا کہ تم وہ پہلے لوگ ہو جنہوں نے تکلامکان کو عبور کیا ہے۔ ہم نے جودوتی کی ہے، وہ ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گا، آپ میرے دل میں رہیں گے۔ اس کے بعد میں نے ہر ایک سے مصافح کیا، سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ یہ اونٹوں کے سامنے ہماری خاص قسم کی تقریب تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے نقشہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں جانتا تھا کہ چند گھنٹوں بعد ہماری امدادی پارٹی ہم سے آ ملے گی۔

میں نے روپرٹ سے پوچھا کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو۔ اس نے جواب میں کہا کہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، تم بتاؤ تمہارے احساسات کیا ہیں؟ میں نے کہا کہ میں کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا، کوشش تو کرتا ہوں، لیکن کچھ بھی نہیں، نہ کوئی کارنامہ انجام دینے کا احساس اور نہ ہی غم۔ کا۔ میں تو بے جان سا ہو گیا ہوں۔ میرا بھی بھی حال ہے، اس نے کہا، سوچتا ہوں کہ جو کرنے نکلے تھے، کر لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہے؟ سب سے پہلے مجھے میرے والد کا یو نین جیک دکھائی دیا ہے فرانس نے ایک اوپنچی جگہ ایک پول سے لٹکا دیا تھا۔ پہلے اس کے رنگ دکھائی نہیں دیے۔ قریب پہنچنے تو رنگ نمایاں ہو گئے اور پھر یوں لگا کہ اس نے شعلے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مجھے لگا کہ میرے والد ستارے میں بیٹھے مجھے دیکھ رہے ہیں اور میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ — صحرائیں ہو گیا۔



حرف آخر

صحرا سے باہر آنے کے تین روز بعد، شمال میں ارمنی کی جانب جاتے ہوئے میرے خیالات گذہ ہو گئے تھے۔ ارمنی سے ہمیں طیارے پر بیچنگ اور وہاں سے ہانگ کانگ اور پھر واپس انگلستان جانا تھا۔ بارہنی کے ساتھ بیٹھے ہوئے میں نے سوچا کہ مہم کا دائرہ مکمل ہو گیا ہے۔ آخری بار میں اور بارہنی مارکیٹ سے تکلامکان جاتے ہوئے اکٹھے سوتے تھے۔ اس وقت ہم تازہ دم تھے اور ایک عظیم ہم پر نکلنے کے خیال سے بہادری کے جذبے سے سرشار تھے۔ لیکن اب گرم سرد چشیدہ ہم جو تھے۔ وقت نے ثابت کیا کہ ہم ہر امتحان سے سُرخ روٹکے ہیں اور بجا طور پر اپنے تجربہ کار ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر گہری جھریاں دیکھیں، جو شدید سردی کے باعث بن گئی تھیں۔ یہ میرے نہیں کسی بوڑھے کے ہاتھ تھے۔ ہم اس گاڑی میں بیٹھے تھے جو صمرا کو عبور کرنے کے لیے استعمال ہوتی رہی تھی۔ ہماری باسیں جانب تکلامکان تھا۔ راز، موت اور اساطیر میں لپٹا ہوا۔ اب وہ ہمارے لیے اتنا خوف ناک نہیں رہ گیا تھا، وہ ہم پر مہربان رہا۔ مستقبل کے مسافروں کے لیے شاید وہ اتنا مہربان نہ ہو۔ ہمارے دامیں جانب لوپ نو صمرا تھا، جہاں چینی ایسی تجربات کرتے تھے۔ اس کے مادر اگوئی کا صمرا تھا۔

میں نے گاڑی میں پڑے ہوئے سامان اور اس کے حصے دیکھے۔ اب وہ ہمارے کام کے نہیں تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک کہانی وابستہ

تھی۔ ہر چیز پر ناکلم پاؤڈر کی سی تہہ جبی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے ہم صحرائوپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ میں نے کیسٹ ریکارڈر کا بٹن دبایا اور گیت سننے لگا۔ ریت کے میلے اور اونٹوں کے قافلے میرے خیال میں آنے لگے۔ ہم فتح یا بلوٹے تھے۔ ہم نے ایک ایسا چیختی قبول کیا تھا جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم اس پر پورے اترسکیں گے۔

لیو بز ہوا مگ میں آخری بار اونٹوں سے سامان اتارنے کے بعد چینی ڈرائیور ہمیں برق رفتاری سے اڑاتے روکیا مگ لے گئے۔ یہ صحرائے عبور کرنے سے بھی زیادہ خوف ناک تجربہ تھا۔ اونٹ دون بعد وہاں پہنچ۔ ہمیں بڑی دھوم دھام سے مارکیٹ سے روانہ کیا گیا تھا۔ لیکن اب جب ہم واپس آئے ہیں تو ہمارے استقبال میں وہ جوش و خروش نظر نہیں آیا۔ میں یونین جیک لہراتا ہوا گلی کوچوں میں گھوما پھرا۔ گیو جن واپس سرخ جنڈا اٹھائے میرے ساتھ تھا۔ ہمارے آگے آگے پھل جھٹریاں چھوڑی اور پٹانے داغے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ہم کے تمام ارکان تھے، جنہوں نے پلاسٹک کے بننے ہوئے پھول اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ پھول سکولوں کے طلباء نے انہیں پیش کیے تھے۔ رات کو بڑے چوراہے میں آگ کا الاؤ جلا دیا گیا، جس کے گرد ہم مقامی موسيقی پر رقص کرتے رہے۔ ارچی سٹک کے دو دن کے سفر کے دوران میں مزید استقبالیہ تقریبات ہوئیں۔ سب سے بڑی تقریب کورلا میں ہوئی، وہاں ملکولیا کے روایتی انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو سونے، چاندی اور مرمر کے پیالوں میں باپی جن پینا پڑی۔ ہم سے تقاضا کیا جا رہا تھا کہ یہ کڑوا کسیلا مشروب ایک ہی گھونٹ میں گلے سے اتار دیں۔ اس کے بعد ہمیں چنگیز خان کی زندگی کے بارے میں ایک تمثیل دکھائی گئی۔ آخر میں چنگیز خان کی فرضی میت کی تدفین کا منظر تھا، رنگارنگ لباسوں میں ملبوس لڑکیاں گیت گارہی تھیں۔

ارچی پہنچتے پہنچتے ہمارے جسم اور ہمارے دماغ معمول کی زندگی سے مطابقت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ صحرائیں زندگی لکھی سادہ تھی اور یہاں شور، ہنگامہ، شراب، مرغن کھانے تھے، جن سے ہم ماںوں نہیں رہے تھے۔ ارچی پہنچتے تو وہاں بکھر گم پیلس سے آیا یہ خط ہمارا منتظر تھا، جس میں لکھا تھا کہ ہر بھیجی یہ جان کر بہت خوش ہوئی ہیں کہ

برطانیہ اور چین کی تکلامکان صحرائے عبور کرنے کی مشترکہ مہم کامیابی سے ہم کنار ہو گئی ہے۔ تمہیں اور ان تمام کو جو اس مہم میں شریک رہے ہیں، اپنی طرف سے اور ہزارلی ہائی نس کی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ہمیں اس سے بڑھ کر کسی تو صیف کی ضرورت نہیں تھی۔

ہر دن کے ساتھ صحراء دور سے دور ہوتا چلا گیا۔ اور وہ ہر شے جس کے سہارے ہم نے یہ سفر طے کیا تھا، ہماری مہم کی قوت محکم بھی بہت جلد کافر ہو گئی۔ ہم اونٹ ریوکیا گل میں چھوڑ آئے تھے۔ جہاں سے وہ شاہراہ ریشم کے ذریعے 400 میل کا سفر کر کے واپس ہوتاں پہنچیں گے۔ سلیمان کا بھائی ان کی رہبری کرے گا۔ ہم نے صدر مقام ارجمند میں اپنے اوپیغور ساتھیوں کو الوداع کہا۔ ارجمند انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا، یہاں سے وہ پہلی بار ہوائی جہاز کے ذریعے کاشغر جائیں گے اور مارکیٹ میں اپنے اہل و عیال سے جا ملیں گے۔ جان اور اینی تھامس اپنے بیٹے کیون اور دو دوستوں کے ساتھ، ارجمند میں ہی قیام کریں گے۔ انہیں ہمارا سامان اور دو گاڑیاں واپس انگلستان لے جانے کی مشکل ذمہ داری پوری کرنی تھی۔ ہانگ کانگ نے انہیں زمینی راستہ سے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ سرما کے وسط میں درہ تختجراہ سے گزر کر پاکستان جائیں۔ ان کی روائی سے قبل چینی حکام نے ریت کے وہ تمام نمونے، جو ریوپرٹ نے بڑی محنت سے جمع کیے تھے، ضبط کر لیے۔ ان میں صحراء کے آغاز سے اختتام تک کے سفر میں، ہر علاقے کی ریت جمع کی گئی تھی۔ یہ آکسفروڈ یونیورسٹی کو پیش کی جانی تھی، چینیوں کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ آخر ریت کے لے جانے میں کیا حرج تھا؟ بعد میں خیال آیا کہ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ اس ریت سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ چین نے ایسی دھاکہ کیا ہے۔ جان کی ٹیم دو ہفتے کے سفر کے بعد کراچی پہنچی، دونوں گاڑیاں بھری جہاز سے انگلستان روانہ کی گئیں۔

صحراء عبور کرنے والی ٹیم ارجمند میں سے طیارے پر بیچنگ روانہ ہوئی۔ گیوجن والی اور لاوزہاؤ ہمارے ساتھ ارپورٹ تک آئے۔ ٹینا بیچنگ کے ارپورٹ پر میری منتظر تھی۔ وہ ایک گھنٹا پہلے ہی ہانگ کانگ سے وہاں پہنچی تھی۔ صرف ڈھائی ماہ پہلے ہی اس

نے مجھے ہی تھرو ائرپورٹ (لندن) سے الوداع کی تھی۔ میں نے صحرائیں کئی بار خیال ہی خیال میں واپسی پر اس سے طنے کا انداز طے کیا تھا۔ لیکن اب جب وہ میرے سامنے تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس نے شاید مجھے دیکھا ہی نہیں، یا میری موجودگی کا اسے علم ہی نہیں ہوا۔ جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا تو وہ دیکھ کر بے ہوش سی ہو گئی۔ میں ایک دبلا پتلا، منجھی شخص، جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، جس کے تن پروہی لباس تھا جو اس نے صحرائیں پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ ہم دونوں لپٹ گئے۔ میرا جسم لرز رہا تھا۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میں نے ہم سرکری ہے۔ میں جب صحرائیں تھا تو فرقہ کے طویل دن اور راتیں گزار رہا تھا، اپنے بیٹوں کے بارے میں تشویش اور اضطراب میں بنتا ہوتا تھا اور بیٹے ماپیسی اور غصے کے عالم میں یہ سوچنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا باپ آخر کیوں کہیں چلا گیا ہے۔ ابتداء ہی میں یہاں کو خیال گزرتا تھا کہ میں شاید زندہ سلامت واپس نہ آ سکوں۔ صحرائی دہشت، اس کے ان خدشات کو تقویت پہنچاتی رہی، تم بالائے ستم یہ کہ میرے گھر سے رخصت ہونے کے بعد اسے سرہانے کے نیچے سے ایک لفافہ ملا جو میں چھوڑ آیا تھا۔ اس میں ایک خط تھا، منگنی کی انگوٹھی تھی، ایک گھڑی تھی، فوجی شناختی کارڈ تھا۔ نیپال میں اپنے باپ کے جنازے میں شرکت کے لیے جب میں نیپال پہنچا اور والدین کے گھر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز میں نے دیکھی وہ منگنی کی انگوٹھی، گھڑی اور شناختی کارڈ تھا۔ تمام چیزیں نہایت نفاست کے ساتھ میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں کو میری یہ چیزیں دیکھ کر لگا کہ تاریخ اپنے آپ کو دُھرا رہی ہے۔

بیجنگ میں میرا اور یہاں کا پھر سے ملاپ آسان نہیں تھا۔ اس میں کئی وقق تھے، جنہیں وقت ہی پر کر سکے گا۔ ہمیں بیجنگ میں ممنوعہ شہر، گرمائی محل اور دیوار چین پر پہنک مناتے ہوئے تہائی کے کئی لحاظ میسر آئے۔ یہاں کو یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ میری روح ابھی تک تکلامکان میں ہے اور ہم میں مصروفیت نے ہر چیز کو گھننا دیا ہے۔ چیزیں ذرا لئے ابلاغ میں مہم کے دوران کی ہماری کامیابیوں کا وسیع تذکرہ ہوا۔ بیجنگ میں تین روزہ قیام میں سرکاری تقریبات، پریس کانفرنسیں اور دوسری مصروفیات کم ہوئیں، اس سے ہمیں صحرائے باہر کی زندگی اور مستقبل سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد ملی۔

چین سے واپسی کے بعد ٹیم کے ارکان اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ بارہی ابھی تک فوج میں ہے۔ اس کی ترقی ہو گئی ہے۔ کیرولین ڈیون میں اپنے خاندان کے باعث کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ روپرٹ افریقہ میں ایک تنظیم کے ساتھ بارودی سرنگیں صاف کرنے میں معروف ہے۔ کیونکہ کیلئے فوریا میں اپنا فونو گرفتار کا کاروبار کر رہا ہے۔ مارک نے فوج چھوڑ دی ہے اور لندن میں اپنے کاروبار کے لیے وقتاً چھین جاتا رہتا ہے۔ رچرڈ شنکھائی میں ایک بُنک کے دفتر میں کام کر رہا ہے۔ جان اور اینی تھامس نے ولیز میں کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ فرانس نے واپسی میں بُنک میں فڈ نیجر کا منصب سنبھال لیا ہے۔ پال پیننگ کر رہا ہے، کرشنا جرنلسٹ ہے۔ ہم سب کے درمیان جو رشتہ ہے، بہت مضبوط ہے اور ہمیں اس کا احساس بھی ہے۔ ہم مل کر ایک تاریخی تجربے سے گزرے ہیں، جو زندگی بھر ہمارے ساتھ رہے گا۔ ایسے لمحات بھی آئے، جب ہم اپنے بارے میں بے شکنی کے شکار ہوئے، پیچھے مڑ کر صحراء کی طرف دیکھتا ہوں تو یہ حقیقت بڑی تقویت کا موجب ہوتی ہے کہ ہمیں ایک خواب کی تعبیرل گئی۔

ڈسپر کے اوائل میں گھر آیا۔ ہپشائر کی وادی میں صبح ہو رہی تھی۔ گاؤں کا ایک دوست مجھے اور ٹینا کو اس پورٹ پر ملا۔ سیدھا ٹکطل جاتے اور بچوں کو ملنے سے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں چند لمحے اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں صبح کی نیم روشنی میں، دریا کے ساتھ کی گلی میں چلتا گیا۔ یہ گلی میرے گھر کو جاتی ہے۔ صبح، صحراء کی طرح خاموش، اور خوبصورت تھی۔ میں نے چاند اور چند ایک ستاروں کو دیکھا اور سوچا کہ میں اور مارک ایک اوپنے ٹیلے پر بیٹھے، ریٹنے ٹیلوں کی قطاروں اور ان کے گذرا ہوتے سایلوں کو دیکھ رہے تھے۔ دور جنوب میں کیون لیون پہاڑ کا سلسلہ تھا۔ میں نے بہ خیریت گھر پہنچنے پر بآواز بلند اظہار تسلیک کیا اور اپنے والد کو یاد کیا۔ میں نے اندر ہیرے میں بچوں کو زور سے چلاتے سنًا، ”ڈیڈی، ڈیڈی“۔ میں گھر آ گیا تھا۔

